ستارۂ صُبح

رنگین و دلآویز افسانوں کا مجموعہ

مترجم

راجہ مہدی علیخاں!

پبلشرز

نرائن دت سہگل اینڈ سنز

بار سوئم

فہرست

نمبر شمار

اِنتساب

تمہاری اُن دو خوبصورت آنکھوں کے نام

جو

ستارۂ صبح سے زیادہ روشن اور باغِ جنّت کے مقدس
ترین کنج میں کِھلے ہوئے نرگس کے کسی پھول سے زیادہ پاک ہیں

مہدی

تعارف

از جناب ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے، ڈی لٹ لیکچرز اورینٹل کالج لاہور

مرا معنئے تازہ مدعاست
اگر گفتہ را باز گویم رواست

اچھی کتابیں تعارفی دیباچوں کی محتاج نہیں ہوتیں۔ میرے خیال میں یہ افسانوں کا مجموعہ بھی کسی تعارف یا پیش لفظ کا محتاج نہیں۔ اس "غنچہ و گل" کے گلدستہ بند محبی راجہ مہدی علی خاں نے اپنی "رسم پسندی" کا ثبوت دیتے ہوئے اس ہیچ مدان رقم سے مطالبہ کیا ہے کہ میں ان گلہائے تر کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا فرض انجام دوں۔ اس لئے محض بطور امتثال امر یہ چند سطور لکھتا ہوں۔

افسانوں کا یہ مجموعہ۔ اوریجنل نہیں بعض مغربی قلمکاروں کے شاہکار اردو کے لباس میں جلوہ آرا ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں بری کہانیاں لکھنے سے یہ بہتر ہے کہ دوسری زبانوں کی اچھی ادبی تخلیقوں کو اردو زبان میں منتقل کر دیا جائے اس وقت ہندوستان میں افسانہ نگاری کا دھارا جس رخ پہ چل رہا ہے۔ اس سے مجھے تو کچھ انحطاط کے آثار نظر آتے ہیں۔ سبب اس کا ظاہر ہے۔ اور وہ یہ کہ یوروپ میں ناول اور مختصر افسانوں کے درمیان کی منزل بہت عرصے میں طے ہوئی۔ اور ناول سے افسانہ کے مرحلہ تک وہاں کے افسانہ نگار اس وقت پہنچے۔ جب کہ نفسیات وقت کا اقتضا یہی تھا۔ لیکن ہندوستان میں درمیان کی تمام منزلیں عبور کئے

بغیر ہی افسانہ نگار انتہائی بلندیوں تک پرواز کرنے لگے۔ نتیجہ یہ کہ اردو افسانہ اپنی ترکیب اور ماہیت کے اعتبار سے ابھی ناپختہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا ارتقاء قدرتی اصولوں کے مطابق نہ ہوا۔

کم لذتم کہ رُوئے ندیدم ز آفتاب
دز خانہ پختم ایں ثمر نیم خام را (نظیری)

ان حالات میں اور بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم سب سے پہلے مغرب کے بہترین افسانوں سے روشناس ہوں۔ تاکہ ان کی فنی خوبیوں اور خوبصورتیوں سے واقف ہو کر اس آرٹ کو مقامی رنگ دے سکیں۔

دنیا میں ہر شخص کا نقطۂ نظر انفرادی ہوتا ہے۔ جس کے مطابق وہ جمال اور جمیل کے اقدار معین کرتا ہے۔ پھر یہی اقدار ہوتے ہیں۔ جو اس کے انتخاب اور تحسین کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ راجہ صاحب نے ترجمہ کیلئے جن افسانوں کو منتخب کیا ہے۔ ان کے انتخاب میں وہی انفرادی مطمع نظر کام کر رہا ہے۔ اور اس مجموعہ کی ترتیب میں انھوں نے صرف دلچسپی ہی کو مدنظر نہیں رکھا۔ بلکہ یہ بھی کوشش کی ہے کہ قارئین ان کو پڑھنے کے بعد زندگی کے مختلف احوال و ظروف کے متعلق ایک ایسا اثر قبول کریں۔ جو انہیں حقیقت اور زندگی کے قریب تر لائے۔

غلام ہندوستان اس وقت جس دور سے گذر رہا ہے۔ اس میں ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے۔ کہ ہم عوام کے ذہن و فکر کو بعض ان سماجی" اور سیاسی مسائل کی طرف متوجہ کریں۔ جن کی طرف سے وہ اب تک غافل رہے ہیں۔ روسی افسانہ واقعیت اور زندگی سے وابستگی کے لئے شہرت رکھتا ہے کیا اچھا ہو تا کہ موجودہ

افسانوں میں بھی گورکی اور چیخوف وغیرہ کے بعض ایسے ترجمے پیش کیے جاتے جن سے عوام کی ذہنیت کے انقلاب کا حال ظاہر ہو سکتا۔ ایسے افسانوں کے شامل ہونے سے اس مجموعہ کی افادیت بہت زیادہ ہو جاتی۔

میں خیال کرتا ہوں کہ یہ مجموعہ بہت مقبول ہوگا۔ اور قارئین کو تخیل اور رومان کی ان نزہت گاہوں میں پہنچانے کے قابل ہوگا۔ جہاں پہنچکر انسانی رُوح فنا اور بقا کے متعلق نئے نظریے قائم کرتی ہے۔ یہی وہ اقلیم ہے۔ جسے بے خبری اور خود فراموشی کی دُنیا کہا جاتا ہے۔

یہ افسانے اگرچہ ترجمہ ہیں۔ لیکن ان کی شگفتگی ضائع نہیں ہوئی۔ راجہ صاحب کو اُردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اور ان کی اس خصوصیت کی تصویر ان افسانوں میں صاف صاف نظر آجاتی ہے۔ بلاشبہ اُنہوں نے ولائیت کے پھول ہندوستانی کیاریوں میں اس خوبصورتی سے لگائے ہیں کہ بے اختیار انہیں داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ امید ہے کہ یہ "خوبصورت کیاریاں" نظارگیانِ گل کے لئے دلکشی کا باعث ہوں گی۔

سید عبداللہ

گمنام حسینہ کا خط

وہ ایک مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس تھا۔ فرانس کے دلکشا پہاڑی علاقے کی سیر کے بعد آج وہ آنا واپس آیا تھا۔ اسٹیشن پر سے اس نے ایک اخبار خریدا۔ خبروں پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور اخبار کی پیشانی پر تاریخ دیکھی۔ جس سے اسے معلوم ہوا کہ آج اس کی سالگرہ ہے۔ آج وہ پورے اکتالیس برس کا ہو چکا تھا۔

مصنف نے اخبار کو جیب میں رکھا۔ ایک ٹیکسی میں سامان رکھا اور اسٹیشن سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچا تو ملازم نے بتایا کہ پچھلے ہفتے اس کی غیر حاضری میں جو خطوط اور رُقعے موصول ہوئے ہیں۔ وہ ایک ڈھیر کی صورت میں میز پر رکھے ہیں۔

مصنف نے اس ڈھیر پر ایک گھبرائی ہوئی نگاہ ڈالی اور ملازم کو چائے تیار کرنے کے لئے کہہ کر خود نہانے چلا گیا۔ نہانے کے بعد وہ باہر آ کر چائے پینے اور میز کے سامنے بیٹھ کر نہایت بے پروائی سے خطوط پڑھنے لگا۔ دو تین خطوط اُٹھا کر اِدھر اُدھر کئے۔ اور کچھ رسالے آگے کی طرف سرکائے۔ معاً اس کی نظر ایک لفافے پر پڑی جو انتہائی کس مپرسی کی حالت میں خطوط کے انبار میں پڑا تھا۔ اُس کے ایڈریس کی طرزِ تحریر

کچھ نسوانی سی تھی۔ مصنف کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس کا خط ہو سکتا ہے۔ کچھ دیر اس لفافے کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد اس نے سگار سلگایا۔ آرام کرسی پر لیٹ کر نہایت اطمینان کے ساتھ لفافے کو چاک کیا۔ اور خط کو بغور پڑھنے لگا۔

خط کیا تھا ایک اچھا خاصا مضمون یا افسانہ تھا۔ افسانہ نگار کو مخاطب کرکے لکھا گیا تھا۔ چھتیس صفحات پر مشتمل تھا۔ تحریر زنانہ تھی اور بہت جلدی سے لکھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ایک ایک حرف سے بیقراری ٹپکتی تھی۔ خط القاب و آداب سے محروم تھا۔ اس "مضمون" یا خط کے ساتھ کوئی اور تعارفی رقعہ نہ تھا۔ جس سے بھیجنے والی عورت کا پتہ یا نام معلوم ہو سکے۔ چنانچہ مصنف نے انتہائی تعجب اور اشتیاق کے ساتھ اس خط کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لیکن معلوم نہ ہو سکا۔ کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔

لفافہ کی لوح پر لکھا تھا۔ "آپ کے نام ——— جو مجھے نہیں جانتے"

مصنف نے لفافے پر جب یہ الفاظ پڑھے تو وہ اور بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ اس نے نہایت بیتابی سے لفافہ چاک کیا اور گمنام عورت کا خط پڑھنے لگا۔ جسے یہاں لفظ بلفظ درج کیا جاتا ہے۔

(۲)

کل میرے لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ یہ میرا سب سے پہلا اور سب سے آخری بچہ تھا۔ میں تین دن اور تین راتوں سے مطلق نہیں سوئی۔

میرا بچہ انفلوائنزا میں مبتلا ہوا۔ اس نے تین راتیں انتہائی درد و کرب میں گذاریں اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ میں ایک تپائی پر اس کی لاش کے قریب

بیٹھی ہوں جس وقت بچہ موت سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ میں اس کے پاس تھی۔ اس کی روحانی اور جسمانی اذیتوں کا دردناک منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آہ۔ مجھ بدبخت کو موت کیوں نہ آئی۔ میری محبت، میری آرزوؤں اور میری تمناؤں کا مرکز تباہ ہو گیا۔

میرے سامنے یہ معصوم لڑکا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ سو رہا ہے۔ اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں جن سے ذہانت اور قابلیت کی جھلک عیاں تھی۔ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی ہیں۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ صلیب کی صورت میں اس کے سینے پر لکھ دیئے ہیں۔ اور اس کی لاش کو ایک سفید چادر سے ڈھانپنے کے بعد اب میز پر بیٹھی یہ خط لکھ رہی ہوں۔

دُنیا میں اب صرف ایک ہی ایسی ہستی باقی رہ گئی ہے۔ جسے مجھ سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے وُہ ہستی آپ ہیں۔ یہ بات آپ کو نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوگی۔ کہ میرا اور آپ کا کس طرح کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ آپ سوچتے ہونگے کہ میں تو اس عورت کو جانتا بھی نہیں۔ نہ اس کے نام سے جو اس کے خط میں درج ہے واقف ہوں۔ لیکن حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

مَیں سب واقعات من وعن آپ سے بیان کرتی ہوں۔ اور آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ مجھے جانتے ہیں۔ خوب جانتے ہیں۔ لیکن مجھے بھول چکے ہیں۔

مَیں نے میز پر پانچ شمعیں جلادی ہیں۔ کمرہ پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا ہے۔ روشنی مُردہ لڑکے کے چہرے پر نثار ہو رہی ہے۔ اس لڑکے کے چہرے کے خدوخال اس کے حالاتِ زندگی اور اپنی دُکھ بھری کہانی کے تمام مناظر مجھے اپنے سامنے نظر آ رہے ہیں۔

آج کل شہر میں انفلوائنزا زوروں پر ہے مجھے بھی بخار ہو رہا ہے۔ سر چکرا رہا ہے پیشانی درد سے پھٹی جا رہی ہے۔ میرا افسانۂ درد وغم ناقابل برداشت ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں

میرے دُکھتے ہوئے بدن سے میری روح پرواز کر جانے والی ہے۔ میں ایک مسافر ہوں ۔ جو منزل کے قریب پہنچ چکا ہے ۔ اور میرے دُکھ درد کا بہت جلد خاتمہ ہونے والا ہے ۔

آج میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں ۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں اپنے دل کا راز عیاں کرنے والی ہوں ۔ آج تک میں نے اس راز کو اپنے دل کے عمیق ترین گوشے میں چھپا رکھا تھا ۔ اب میں یہ راز اس شخص کے سپرد کر دینے والی ہوں جو اس کا مالک ہے ۔ آہ دُنیا میں میرے اس راز سے کوئی واقف نہیں ۔ آپ واقف ہیں لیکن بھول چکے ہیں ۔

جس وقت آپ کو یہ خط پہنچے گا ۔ میری شمعِ حیات گُل ہو چکی ہو گی بہت ممکن ہے کہ آپ میرا خط پڑھ کر مغموم ہو جائیں ۔ اور جواب دینے کے لئے مجھے ڈھونڈیں اور مجھ سے ملنا چاہیں ۔ لیکن میں اس دُنیا میں نہیں ہونگی ۔ آپکی پشیمانی میرے کسی کام نہ آئے گی ۔

اگر میں انفلوئنزا کے حملہ سے بچ گئی ۔ تو اس عریضے کو ضائع کر دونگی ۔ اور جس طرح آج تک اس راز کو چھپاتی رہی ہوں ۔ اب بھی اس کو چھپا لوں گی ۔ یہ راز پہلے کی طرح محفوظ ہو جائے گا ۔ اور میں پھر پہلے کی طرح خاموش اور مایوس زندگی بسر کرنے لگوں گی ۔ اگر میں مر گئی تو یہ خط کسی نہ کسی طرح ڈاک میں ڈال دیا جائیگا ۔ میں اس کا انتظام کر چکی ہوں ۔

آپ میرے اس خط کو ضرور پڑھیں ۔ شروع سے لیکر آخر تک ، یہ سمجھ کر کہ یہ ایک ایسی عورت کی پہلی اور آخری تحریر ہے ۔ جواب کبھی اس دُنیا میں نہ آئیگی ۔ اگرچہ میری تحریر آرٹ ۔ دلکشی اور شعریت سے خالی ہے ۔ لیکن آخر یہ ایک دُکھی دل کی کہانی ہے ۔ اس میں حقیقت ہے ۔ جوش ہے سچے واقعات کا نقشہ ہے ۔ اور اس کے ہر لفظ میں عشق مقدس سسکیاں لے رہا ہے ۔ آپ ایک مُردہ عورت کی تحریر سے خوفزدہ نہ ہوں ۔ یہ مردہ عورت اب نہ آپ کی محبت کی طلبگار ہے ، نہ آپ سے التفات کی درخواست کرتی ہے ۔

نہ اب یہ آپ کے رحم وکرم کی محتاج ہی ہے۔ یہ اب اس دُنیا میں ہی موجود نہیں۔

یہ خط کیا ہے؟ ــــ ایک افسانہ ہے۔ اس عورت کی محبّت کا جو شروع سے لیکر تا دمِ آخر آپ کی رہی۔ اس کی ہر سانس آپ کے تصوّر کی خوشبو سے معطّر تھی۔ اور اب وہ اپنی جان آپ کے قدموں پر نثار کر رہی ہے۔ وہ اب آپ سے صرف ایک بات کی طالب ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ اس خط کی ہر بات پر یقین کر لیں۔ کسی بات کو تصنّع اور جھوٹ سے تعبیر نہ کریں۔ آہ! ایک ماں کبھی اپنے بچّے کی لاش کے پاس بیٹھ کر جھوٹ نہیں بول سکتی!

میں اب اپنی زندگی کا افسانہ آپ کو سُنانا چاہتی ہوں۔ اپنے درد وغم کی مکمل داستان سُنا کر آپ کو رنجیدہ نہ کروں گی۔ گھبرایئے نہیں۔

میری زندگی کی ابتدا کب ہوئی؟ ــــ اس وقت جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا۔ اس سے پہلے میں اپنی زندگی کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ لیکن میرے نزدیک میری عمر کے اس حصّے کوئی اہمیت حاصل نہیں مجھے بالکل یاد نہیں کہ میری پہلی زندگی کس طرح گذری۔ بہر حال، پہلی بار جب میں نے آپ کو دیکھا۔ میری عمر چودہ سال تھی۔ آپ اس وقت بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ جس میں اب ہیں اور جس کے ایک کمرے میں بیٹھ کر آپ اس وقت میرا خط پڑھ رہے ہیں۔ آپ جس بالاخانے میں رہتے ہیں۔ اس کے بالائی زینے کے عین سامنے کے مکان میں ہم رہا کرتے تھے۔ وہ چھوٹا سا کمرہ جس میں بلبل کا ایک پنجرہ لٹکا رہتا تھا۔ ہمارا ہی تھا۔ میں اور میری امی اسی مکان میں رہتے تھے۔ اب میں کسی اور ہی جگہ ہوں۔ آہ! اب یہ بتلانے سے کیا فائدہ کہ میں کہاں رہتی ہوں!

(۳)

آپ یقیناً مجھے اور میری ماں کو بھول چکے ہونگے۔ آپ کو شاید یاد ہوگا۔ کہ آپ کے مکان کے سامنے کے کمرے میں ایک فوجی جمعدار کی بیوہ اور اس کی لڑکی رہا کرتی تھی۔ میری امی اب دوسری دُنیا کو سدھار چکی ہیں کچھ دیر پہلے میں بھی ماں تھی۔ مگر اب میرا بچّہ مر چکا ہے۔ اور میں بھی اس کے پیچھے اس کی تلاش میں جانے والی ہوں۔

آپ کو بھلا کیسے یاد آ سکتا ہے کہ میں کون ہوں۔ آپ کو میرا نام تک معلوم نہ ہوگا کیونکہ ہمارے مکان پر میرے نام کا کوئی بورڈ آویزاں نہ تھا۔ شاذ و نادر ہی ہم سے کوئی ملنے آتا تھا۔ ہم لوگ بہت ہی خاموش اور تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ بھلا آپ کو آج سے پندرہ سال پہلے کی بات کیسے یاد رہ سکتی ہے۔ آپ یقیناً ہمیں دل سے بھلا چکے ہونگے۔ لیکن مجھے وہ تمام واقعات جو اس عرصے میں گزرے بخوبی یاد ہیں جس وقت میں نے آپ کے آنے کی اطلاع پائی۔ اس وقت سے لے کر اب تک کے واقعات من و عن بیان کر سکتی ہوں۔

جس مکان میں آپ اب رہتے ہیں۔ وہاں آپ کے آنے سے پہلے دو جھگڑالو میاں بیوی رہتے تھے۔ ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔ مرد شرابی تھا۔ جب وہ شراب پی کر گھر آتا۔ تو بیوی اس کی خوب مرمت کیا کرتی۔ اس گھر میں آئے دن ایک کہرام مچا رہتا۔ ہم لوگ ان کی بدتمیزی سے سخت تنگ آ چکے تھے۔ لیکن جب ہم نے سُنا کہ ہماری ہمسائیگی میں ایک شریف مصنف آنے والے ہیں۔ تو ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ جب آپ کے آنے کی خبر گرم ہوئی تو تمام گھر اور کوڑا وغیرہ صاف کر دیئے گئے۔

ایک دن نیچے سڑک پر ہمیں اسباب کی ایک گاڑی سی اس طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔

میں اپنے برآمدے میں کھڑی ہو کر فرنیچر اُتارنے چڑھانے کا تماشا دیکھنے لگی۔ آپ کا ملازم گاڑی کے ساتھ تھا۔ اس نے گاڑی سے سامان اُتروا کر مناسب مقامات پر سجا دیا۔ دیواروں پر تصویریں لگا دی گئیں۔ کواڑوں اور کٹہروں پر روغن کرا دیا گیا۔ اور مکان دلہن کی طرح آراستہ ہو گیا۔

دوسرے دن ایک اور گاڑی آئی جس میں آپ کی کتابیں لدی تھیں۔ آپکی بیشمار کتابوں کا انبار دیکھ کر میں باغ باغ ہو گئی۔ چھوٹی بڑی مجلد اور غیر مجلد کتابوں۔ اخباروں اور رسالوں کا ایک ڈھیر لگا تھا۔ میرے پاس بھی کچھ کتابیں تھیں لیکن چھوٹی چھوٹی اور حقیر۔ میں آپ کی عظیم الشان کتابوں سے اپنی کتابوں کا مقابلہ کر کے دل ہی دل میں شرما گئی۔ نہ جانے کیوں۔

میں یہ چھوٹے چھوٹے واقعات اِس لئے لکھ رہی ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ آپ میری زندگی میں کس طرح ظاہر ہوئے۔ آپ نے میرے دل و دماغ پر آتے ہی کس قسم کا اثر ڈالا۔ آپ نے مجھ پر کیسے قبضہ کر لیا۔ اور ان تمام واقعات نے میری آئیندہ زندگی میں کیا انقلاب برپا کیا۔

میں یہ سمجھتی تھی کہ آپ ایک بوڑھے آدمی ہونگے۔ آپکے سر پر لمبے لمبے سفید بال ہونگے۔ آپ کی ڈاڑھی لمبی اور سفید ہوگی۔ آنکھوں پر چشمہ لگا ہوگا۔ اور بڑھاپے نے آپ کی کمر جھکا دی ہوگی۔ آپ معمّر اور کمزور ہو گئے۔ لیکن اپنا سامان آنے کے تیسرے دن بعد جب آپ مکان میں آئے۔ اور میں نے آپ کو موٹر کے دروازے سے باہر نکلتے دیکھا تو فرطِ حیرت سے میں نے اپنی انگلیاں دانتوں میں داب لیں۔ آپ ایک لمبے قد کے خوبصورت نوجوان تھے۔ میں حیران تھی کہ اتنی چھوٹی عمر ہی میں آپ کس طرح اتنے مشہور اور اتنے نامور مصنف بن گئے۔ کس طرح آپ نے بیسیوں ناول اور بے شمار افسانے اس چھوٹی سی عمر میں لکھ ڈالے۔

آپ نے نہایت پھُرتی سے سیڑھی پر قدم رکھا۔ اور نہایت چُستی سے چڑھنا شروع

کیا ہیں آپ کے جسم کی بناوٹ اور آپ کی شوخی دیکھ کر بہت متعجب ہوئی۔ آپ کی ہر ادا مجھے بھا گئی۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے میں آپ کی ہر حرکت پر نثار ہوئی جا رہی ہوں۔ جب آپ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو میں اپنے کمرے میں واپس آ گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب آپ باہر آئیں گے تو میں دوبارہ آپ کو دیکھوں گی۔

(۴)

آپ کو دیکھ کر میری جو حالت ہوئی۔ وہ بیان سے باہر ہے۔ میرے پڑوس میں ایک نامور مصنف آکر ٹھیرا تھا۔ میں کیوں نہ خوشی سے پاگل ہو جاتی میں ہر روز آپ کو آتے جاتے دیکھنے لگی۔ آپ نے کبھی مجھے دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ میں آپ کے ہر ملاقاتی اور مہمان کو دیکھ سکتی تھی لیکن میں آپ کو نظر نہ آ سکتی تھی۔ آپ کے پاس زیادہ تر کالجوں کے لڑکے آیا کرتے جو خوب شور وغل مچاتے۔ آپ اُن سے گھنٹوں محو گفتگو رہتے۔ ان کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے غرضکہ ہر وقت آپکا ماحول ادب اور شعریت کا مرکز بنا رہتا تھا۔ اکثر نوجوان عورتیں بھی آپکے ناول پڑھ کر آپ سے راہ ورسم بڑھانے آیا کرتیں۔ لیکن آپ کو دیکھنے کیلئے جو بیقراری میرے دل میں تھی۔ وہ ایک معصوم بچے کے جذبات کی صحیح تصویر تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کہ آپ کے ادبی مشاغل سے عورتوں اور لڑکیوں کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب تو میں اب سمجھی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے آپ کے مداحوں کے حلقے میں عورتوں کو دیکھ کر مسرت ہوتی تھی۔ میں خوش تھی کہ آپ کو عورتوں سے ملنے میں عار نہیں۔ کیونکہ اس سے مجھے یہ امید بندھ گئی تھی کہ میں کبھی آپ کی محفل میں بار پا سکونگی۔ اور آپ کے افسانوں اور ناولوں کے متعلق اپنی نہایت اچھی رائے بیان کروں گی۔ اس وقت میری عمر صرف چودہ برس کی تھی۔ اس لئے مجھے اپنے دل کی خلش کا سبب معلوم نہ تھا۔ میں نہیں جانتی تھی۔ کہ معصوم

الفت اسی جذبے کا نام ہے۔

(۵)

میں نے محبت کی معصوم نگاہوں سے پہلے ہی دن آپ کو دیکھنا شروع کر دیا تھا میں نے تو اپنا دل اسی دن آپ کے قدموں پر نثار کر دیا تھا جب پہلے پہل آپ اس گھر میں تشریف لائے تھے۔ میں اس دن اپنے بالاخانے کی دہلیز پہ کھڑی تھی۔ مجھے وہ دن اب تک یاد ہے۔

ایک دن میں اپنے سکول کی ایک سہیلی کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ یکایک ایک موٹر نظر آئی۔ آپ بڑی تیزی اور پھرتی کے ساتھ موٹر سے باہر نکلے تو مجھے آپکی یہ ادا اس قدر پسند آئی (اور اب بھی پسند ہے) کہ میں نے معاً فیصلہ کر لیا کہ میں زینے کا دروازہ آپ کے لئے کھول دونگی۔ اور آپ کی راہ میں کھڑے ہو کر آپ کے جسم سے متصادم ہو جاؤنگی۔ تاکہ اسی طرح میری اور آپ کی جان پہچان ہو جائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں دوڑ کر آگے بڑھی اور زینے کا دروازہ کھول دیا۔ آپ آئے تو میں آپ کے ساتھ ٹکرا گئی۔ آپ نے "شکریہ" کا لفظ کہہ کر آگے بڑھنا چاہا۔ لیکن آپ نے غضب یہ کیا کہ جاتے ہوئے میری آنکھوں سے اس طرح اپنی نشیلی آنکھیں ملا گئے کہ میرے جسم کا رُواں رُواں آپ پر قربان ہو گیا۔ میرے جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اور میں شرما کر پیچھے ہٹ گئی میں گھبرا گئی تھی۔ کیونکہ اس دن میں پہلی مرتبہ ایک مرد سے دوچار ہوئی تھی۔ میری سہیلی نے مجھے گھبرا کر کہا۔ تم انہیں دیکھ کر گھبرا کیوں گئی تھیں؟ یہ کون ہیں؟ کیا تمہیں ان سے محبت تو نہیں؟

میں نے بڑی بدمزاجی کے ساتھ اپنی سہیلی کے سوالات کا جواب دیا اور اپنے کمرے میں

واپس آکر گھنٹوں آپ کے خیالات میں کھوئی رہی۔

(۲)

میں روزِ اوّل سے آپ سے محبّت کرتی ہوں۔ اس سے پہلے آپ نے "عشق" اور "محبّت" کے الفاظ بیسیوں عورتوں سے سُنے ہونگے۔ بہت ممکن ہے کہ کئی عورتوں نے آپ سے محبّت کی ہو لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں۔ کہ جیسی محبّت میں نے آپ سے کی اور کرتی ہوں۔ دُنیا کی کسی اور عورت نے نہ کی ہوگی۔ میں نے جس ایثار، صبر، عقیدت اور خلوص دل کے ساتھ آپ سے محبّت کی ہے۔ اس کا حال صرف مجھے یا میرے خدا کو معلوم ہے۔ آپ عشق کی بے پناہ شدتوں سے واقف نہیں۔ کیونکہ آپ نے کبھی کسی عورت سے والہانہ عشق نہیں کیا ہوگا۔ ایک لڑکی نے اپنے دل میں ایک مشہور مصنف کو جگہ دی۔ اور دل ہی دل میں اس سے اتنی محبت کی۔ اس کی اتنی خاموش پرستش کی۔ اس سے اتنی وفا کی کہ اس کی نظیر تمام دُنیا میں نہ ملے گی۔

میں بڑے جوش اور سرگرمی کے ساتھ اپنے "عہدِ وفا" پر قائم رہی۔ میں ایک بھولی بھالی اور معصوم لڑکی تھی۔ تنہا اور کس مپرس تھی۔ میری کوئی سہیلی نہ تھی۔ جس سے میں اپنے دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ یا محبت کی دشواریوں کے متعلق اس سے کوئی مشورہ لیتی میری دُنیا صرف اپنی ہی ذات تک محدود تھی۔ یہاں تک کہ آپ کو بھی میرے دلی جذبات کا علم نہ ہُوا۔ میں خود حیران تھی کہ میری عقیدت محبّت میں کیوں تبدیل ہو رہی ہے میں روز بروز کیوں آپ کے قدموں پر اپنی جان نثار کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ مضطرب ہوتی جا رہی ہوں۔

آپ ایک مصنف تھے۔ آپ کو کتابیں پڑھنے سے دلچسپی تھی میں نے سوچا جس

چیز سے آپ کو دلچسپی ہے۔ مجھے بھی اس سے دلچسپی ہونی چاہئیے۔ چنانچہ میں نے اپنی کتابیں زیادہ شوق سے پڑھنی شروع کیں۔ سکول کی کتابوں کے علاوہ بھی کئی کتابیں پڑھ ڈالیں اس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ سکول میں میری قابلیت مشہور ہوگئی۔ ہر طرف میری لیاقت کے چرچے ہونے لگے۔ میں اپنی جماعت میں اوّل رہی۔ امی جان نے مجھے پیار کیا۔ اور استانیوں نے بھی پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا ــــ اور یہ سب کچھ ہُوا آپکی وجہ سے اب میں خوابوں کی دُنیا میں رہنے لگی۔ آپ کے خیالات میری رگ رگ میں پیوست ہو گئے ـــ ــــ اُلفت کے اس دور میں میں نے کیا طفلانہ حرکات کیں۔ آپ سنیں تو ہنس دیں۔ میں آپ کے دروازے کے ہینڈل کو آتے جاتے چومتی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اس کو آپ کا ہاتھ لگا ہے۔ کبھی کبھی میں آپ کے دروازے پر آنکھیں لگاتی تھی۔ اور اگر مجھے آپ کے فرش پر کاغذ کا کوئی پُرزہ مل جاتا تو میں اسے اُٹھا لیتی۔ اس کو پیار کرتی اور گھنٹوں اس کی طرف دیکھتی رہتی۔ غرضیکہ اس قسم کی ہزاروں باتیں ہیں۔ جنہیں میں اس وقت بیان نہیں کر سکتی۔

عرصہ ہُوا میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ میری امی جان کو ابا جان کے زمانہ سے ایک معمولی سی پنشن ملتی تھی۔ اسی پر ہمارا گذارا تھا۔ ہمارے ایک مالدار رشتہ دار کبھی کبھی ہمارے یہاں آیا کرتے تھے لیکن مجھے اُن سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک دن امی جان نے مجھے بلا کر کہا "بیٹی میں تم سے آج ایک خاص بات کہنا چاہتی ہوں" میں ان کا یہ فقرہ سن کر پریشان سی ہوگئی۔ کیونکہ میں نے سمجھا کہ میری محبت کا راز آشکار ہوگیا ہے اور ابھی میری شامت آئے گی۔ میں ڈرتے ڈرتے امی جان کے قریب آئی۔ تو وہ کہنے لگی بیٹی! موجودہ پنشن میں ہمارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ ہم بڑے غریب آدمی ہیں میں چاہتی ہوں کہ تمہاری

واپس آکر گھنٹوں آپ کے خیالات میں کھوئی رہی۔

(۴)

میں روز اوّل سے آپ سے محبّت کرتی ہوں۔ اس سے پہلے آپ نے "عشق" اور "محبّت" کے الفاظ بیسیوں عورتوں سے سُنے ہونگے۔ بہت ممکن ہے کہ کئی عورتوں نے آپ سے محبّت کی ہو لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ جیسی محبّت میں نے آپ سے کی اور کرتی ہوں۔ دُنیا کی کسی اور عورت نے نہ کی ہوگی۔ میں نے جس ایثار، صبر، عقیدت اور خلوص دل کے ساتھ آپ سے محبّت کی ہے۔ اس کا حال صرف مجھے یا میرے خدا کو معلوم ہے۔ آپ عشق کی بے پناہ شدّتوں سے واقف نہیں۔ کیونکہ آپ نے کبھی کسی عورت سے والہانہ عشق نہیں کیا ہوگا۔ ایک لڑکی نے اپنے دل میں ایک مشہور مصنف کو جگہ دی۔ اور دِل ہی دِل میں اس سے اتنی محبت کی۔ اس کی اتنی خاموش پرستش کی۔ اس سے اتنی وفا کی کہ اس کی نظیر تمام دُنیا میں نہ ملے گی۔

میں بڑے جوش اور سرگرمی کے ساتھ اپنے "عہدِ وفا" پر قائم رہی۔ میں ایک بھولی بھالی اور معصوم لڑکی تھی۔ تنہا اور کس مپرس تھی۔ میری کوئی سہیلی نہ تھی۔ جس سے میں اپنے دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ یا محبّت کی دشواریوں کے متعلق اس سے کوئی مشورہ لیتی میری دُنیا صرف اپنی ہی ذات تک محدود تھی۔ یہاں تک کہ آپ کو بھی میرے دِلی جذبات کا عِلم نہ ہُوا۔ میں خود حیران تھی کہ میری عقیدت محبّت میں کیوں تبدیل ہو رہی ہے میں روز بروز کیوں آپ کے قدموں پر اپنی جان نثار کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ مضطرب ہوتی جا رہی ہوں۔

آپ ایک مصنف تھے۔ آپ کو کتابیں پڑھنے سے دلچسپی تھی میں نے سوچا جس

چیز سے آپ کو دلچسپی ہے۔ مجھے بھی اس سے دلچسپی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اپنی کتابیں زیادہ شوق سے پڑھنی شروع کیں۔ سکول کی کتابوں کے علاوہ بھی کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ سکول میں میری قابلیت مشہور ہو گئی۔ ہر طرف میری لیاقت کے چرچے ہونے لگے۔ مَیں اپنی جماعت میں اوّل رہی۔ امی جان نے مجھے پیار کیا۔ اور استانیوں نے بھی پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا —— اور یہ سب کچھ بھیا آپکی وجہ سے اب میں خوابوں کی دُنیا میں رہنے لگی۔ آپ کے خیالات میری رگ رگ میں پیوست ہو گئے —— اُلفت کے اس دور میں مَیں نے کیا طفلانہ حرکات کیں۔ آپ سنیں تو ہنس دیں۔ میں آپ کے دروازے کے ہینڈل کو آتے جاتے چومتی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اس کو آپ کا ہاتھ لگا ہے۔ کبھی کبھی مَیں آپ کے دروازے پہ آنکھیں لگاتی تھی۔ اور اگر مجھے آپ کے فرش پہ کاغذ کا کوئی پُرزہ مل جاتا تو مَیں اسے اٹھا لیتی۔ اس کو پیار کرتی اور گھنٹوں اس کی طرف دیکھتی رہتی۔ غرضیکہ اس قسم کی ہزاروں باتیں ہیں۔ جنہیں میں اس وقت بیان نہیں کر سکتی۔

عرصہ ہُوا میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ میری امی جان کو ابّا جان کے زمانہ سے ایک معمولی سی پنشن ملتی تھی۔ اسی پر ہمارا گذارا تھا۔ ہمارے ایک مالدار رشتہ دار کبھی کبھی ہمارے یہاں آیا کرتے تھے لیکن مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک دن امی جان نے مجھے بلا کر کہا کہ "بیٹی میں تم سے آج ایک خاص بات کہنا چاہتی ہوں۔" میں ان کا یہ فقرہ سن کر پریشان سی ہو گئی۔ کیونکہ مَیں نے سمجھا کہ میری محبت کا راز آشکار ہو گیا ہے اور ابھی میری شامت آنے گی۔ مَیں ڈرتے ڈرتے امی جان کے قریب آئی۔ تو وہ کہنے لگی بیٹی! موجودہ پنشن میں ہمارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ ہم بڑے غریب آدمی ہیں میں چاہتی ہوں کہ تمہاری

شادی کر دوں۔ یہ صاحب جو ہمارے گھر اکثر آتے جاتے ہیں۔ ہمارے عزیز اور تمہارے والد کے دوست ہیں۔ بڑے امیر آدمی ہیں۔ وہ اپنے بنگلے میں ہمیں بلا لیں گے اور وہاں تمہاری تعلیم کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اس مہینے کے آخر میں مَیں شہر چھوڑ کر لائل پور چلی جانا چاہتی ہوں۔ وہاں ہماری بہتر زندگی کا آغاز ہو گا۔"

یہ سُن کر مجھ پر بجلی سی گر گئی۔ مَیں نے اپنے دل میں سوچا "اے خدا! کیا ہمیں یہ شہر چھوڑ دینا پڑے گا۔ جہاں مجھے اپنے محبوب کا دیدار میسر ہے۔ جہاں میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے محبوب کی یاد میں بسر ہوتا ہے۔ کیا وہ شہر جس کی سڑکوں پر مجھے آپ چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ اب میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ مَیں بمشکل وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ میری دُکھ بھری نگاہوں سے میری والدہ نے شاید یہ اندازہ لگایا ہو گا۔ کہ مَیں نے اپنے پیدائشی شہر کو چھوڑنے پر افسردہ ہوں۔ مَیں نے چاہا کہ امی جان کے فیصلے کو بدل دوں۔ لیکن جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتی تھیں۔ تو اس سے کبھی نہ ٹلتی تھی۔ اسی شہر میں رہنے پر اصرار کرنے کے لئے میرے کوئی معقول دلیل بھی نہ تھی۔ رونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مَیں اپنی چارپائی پر گر گئی۔ اور اتنا روئی کہ مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ کب سحر ہوئی ہے۔

(۷)

یہ آخری دن تھا۔ جو مجھے اس شہر میں بسر کرنا تھا۔ مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ آج مَیں ضرور آپ سے ملوں گی۔ میری والدہ بھی اتفاق سے گھر پر نہ تھیں۔ اسلئے آپ کے گھر آنا میرے لئے آسان تھا۔ جب میں آپ کے گھر کے سامنے پہنچی۔ میرا جسم بید مجنوں کی طرح تھر تھر کانپنے لگا۔ ادھر دل میں شوق دید چٹکیاں لے رہا تھا تو ادھر رسوائی کے اندیشے

سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گھنٹی بجائی۔ اگر آپ اس وقت آ جاتے تو میں کہتی "مجھے اپنی لونڈی بنا کر پاس رکھ لیجئے۔ اپنے گھر کی چار دیواری میں مجھے پناہ دیجئے۔ اور اس شہر سے ہرگز ہرگز نہ جانے دیجئے۔

میں آپ کو یقین دلاتی ہوں میری دلی آرزو تھی کہ میں تمام عمر آپ کی کنیز بن کر آپ کے قدموں میں بسر کروں گی۔ لیکن افسوس آپ سے نہ مل سکی۔ گھنٹی بیکار بجتی رہی۔ آپ گھر پر نہ تھے۔ آپ کا نوکر بھی گھر پر نہ تھا۔ میں افسردہ خاطر واپس آ گئی۔ اپنے پلنگ پر لیٹ کر اور منہ تکئے میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں سچ عرض کرتی ہوں۔ کہ اس وقت میرے دل میں آپ کو جی بھر کر دیکھنے کے سوا اور کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ جنسی جذبہ ذرا برابر بھی میرے دل میں نہ تھا۔ میں صرف آپکو دیکھنے اور آپ سے باتیں کرنیکی متمنی تھی۔

میں دیر تک آپ کا انتظار کرتی رہی۔ ذرا ذرا سی آہٹ سے چونک اٹھتی تھی یہاں تک کہ رات یونہی گذر گئی۔ اس عرصہ میں میری امی بھی آ گئیں۔ اور آ کر سو گئیں۔ لیکن میں بستر پہ بیدار رہی۔ امی جان سو گئیں تو میں نے یہ موقعہ غنیمت جانا۔ اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر سخت سردی تھی۔ سرد ہوا جسم میں سوئیاں چبھوتی تھی۔ ہر چیز منجمد ہو رہی تھی۔ میں نے آ کر پھر گھنٹی بجائی لیکن آپکے گھر سے پھر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے سوچا جب تک آپ نہ آئیں گے۔ میں سردی کے باوجود یہیں بیٹھی رہونگی۔ آپکے دروازے تک جانے والے راستے میں ایک لمبا سا ٹاٹ بچھا تھا۔ میں وہیں لیٹ گئی۔ اس خیال سے کہ جب آپ آئیں تو آپکے قدموں کی ٹھوکر مجھے لگے۔ اور میں اٹھ کر آپ کے قدموں کو چوم لوں۔ میں سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ لیکن آپ کو دیکھنے اور اپنے جسم کو آپ کے قدموں کی ٹھوکر لگوانے کے لئے میں یہ سب تکلیفیں بخوشی جھیلنے کیلئے تیار تھی۔ میں نے دو گھنٹے تک اس سردی میں آپ کی خاطر موت کی سی

تکلیف برداشت کی۔

آخر کار آپ تشریف لائے تو صبح نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے دروازوں کے کھلنے کی آواز سنی۔ سیڑھیوں سے آپ کے قدموں کی دلچسپ اور دلکش چاپ نغموں کی طرح میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں آپ کے قدم چومنے کے لئے مضطرب ہو گئی۔ لیکن ہمت جواب دے گئی۔ میں اندھیرے میں ایک طرف ہو گئی۔ آپ آگے بڑھے اور دروازے پر ہاتھ رکھا۔ تاریکی میں لیونڈر کی لپٹیں میرے بدن کو چومنے لگیں۔ مجھے ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کے ہمراہ ایک عورت بھی ہے۔ عورت آپ کے ساتھ اندر چلی گئی۔ جس نے باقی رات اور دوسرے دن کا بیشتر حصہ آپ کیساتھ بسر کیا۔ اب میں یہ دیکھ کر کہ آپ کسی عورت کو محبت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ آتش رشک و حسد سے جلنے لگی۔ صبح جب میں اُٹھی تو میری آنکھیں رو رو کر سوج چکی تھیں۔

اسی روز ہم انسبرگ روانہ ہو گئے۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہ رہی تھی۔ کہ میں امی جان کو اس سفر سے روکوں۔

(۸)

کل شب میرے لڑکے کی رُوح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ چونکہ میں آپکو خط لکھ رہی ہوں۔ اس لئے میں نے کسی کو اطلاع نہیں دی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں لوگ آئیں گے۔ اور ایک تابوت میں میرے لڑکے کی نعش کو بند کر کے لے جائیں گے۔ اور قبر میں دفن کر دینگے۔ مگر میں زندہ ہوئی تو مجھے تسلی دینگے۔ طرح طرح کے فقروں اور لفظوں سے میرا جی بہلانے کی کوشش کریں گے لیکن ہمدردی کے الفاظ میرے دل پر کوئی خوشگوار اثر نہیں ڈال سکینگے۔ سب لوگ مجھے تسلیاں دیدیکر چلے جائینگے۔ اگر میں بے غیرت زندہ رہی (خدا نہ کرے

کہ میں زندہ رہوں) تو میں تنہا ہو نگی۔ کیونکہ انسانوں میں رہ رہ کر تنہائی کا جو احساس ہوتا ہے وہ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ لفظوں میں اس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔

جب میں انسبرگ پہنچی تو میری عمر سترہ سال کی تھی۔ اُنیس برس کی عمر تک وہاں ہی رہی۔ میرے رشتہ دار واقعی بہت نیکدل انسان تھے۔ وہ ہماری ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ لیکن میرا دل کسی طرح نہیں بہلتا تھا۔ میں نہ کبھی تھیٹر گئی نہ کسی اور سیر تفریح میں حصّہ لیا۔ میں اپنی ہم عمر لڑکیوں کی صحبت سے بھی گھبراتی تھی۔ دن بھر آپکی یاد میں محو ہو کر آنسو بہاتے رہنا میرا بہترین مشغلہ تھا۔ آپ کے سوا اور کسی پر محبّت کی نگاہ ڈالنا میں گناہ سمجھتی تھی۔ جوان لڑکے میری طرف محبّت بھری نگاہوں سے دیکھتے لیکن میں کسی کی طرف بھی ملتفت نہ ہوتی۔ اخبارات اور رسائل میں آپ کے مضامین اور افسانے پڑھ پڑھ کر میں خوش ہوا کرتی۔ میں نے آپ کا ہر ناول کئی کئی مرتبہ پڑھا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے آپ کے ہر ناول کا ہر حصّہ ازبر ہو گیا۔ آپ کو کیا معلوم تھا کہ میرے دل میں آپ کی محبّت نے کتنا زبردست طوفان برپا کر رکھا ہے۔

اِس وقت میری عمر اُنیس برس کی تھی ایک جوان عورت کے دل میں جوان مرد کے متعلق جو خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ وہی میرے دل میں بھی پیدا ہونے لگیں۔ میرے دل میں اب جبت کرنے کی میٹھی میٹھی آرزوئیں چٹکیاں لینے لگیں۔ میں اب یہ چاہنے لگی کہ اپنے جسم کا ایک ایک حصّہ آپ کے جسم سے پیوست کر دوں۔

اب میری یہی آرزو تھی کہ کسی طرح انسبرگ کو خیرباد کہہ کر وی آنا پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں ایک دن وی آنا روانہ ہو گئی۔ جب میں ریلوے اسٹیشن سے آپ کے مکان پر پہنچی۔ تو میں نے دیکھا کہ آپ کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہے۔ اور کمرہ روشن ہے۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ شہر کی خوابیدہ فضائیں جاگ اُٹھی ہیں۔ اور دُنیا کا ذرہ ذرہ میرے گرد خوشی سے رقص کر

رہا ہے۔ میرے اور آپ کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ مَیں سردرات میں کئی گھنٹے آپ کے مکان کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ جب آپ کے کمرے میں روشنی گل ہو گئی۔ تو مَیں نے واپس اسٹیشن کی راہ لی۔

(۹)

مَیں وہی آنا آکر ایک دکان میں ملازم ہو گئی۔ دکان رات کے نو بجے بند ہوتی تھی۔ مَیں ہر روز رات کو آپ کے مکان کے سامنے آکر دیر تک وہاں کھڑی رہتی اور آپ کی کھڑکی دیکھا کرتی آپ مکان میں داخل ہوتے یا باہر نکلتے۔ تو آپ کے دیدار سے میری دُکھ بھری آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ ایک دن میں آپ کے مکان کی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی کہ آپ مجھے دُور سے اس طرف آتے دکھائی دیئے۔ میرا جی چاہا کہ بڑھ کر آپ سے لپٹ جاؤں۔ لیکن ہمّت جواب دے گئی۔ مَیں اُنیس سال کی عورت سے ایک دم چودہ سال کی لڑکی بن گئی۔ اور گھبرا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔

ایک روز آپ ایک عورت کی کمر میں بازو ڈال کر آئے۔ مَیں آپ کو ایک عورت سے اس قدر ملتفت دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔ مجھے یوں معلوم ہُوا۔ جیسے کسی نے مجھے ذبح کر دیا ہے۔ میرے جسم کی بجلی نے میرے جسم کے روئیں روئیں میں آگ لگا دی۔ میں زار و قطار رونے لگی۔ اور مَیں نے قطعی ارادہ کر لیا۔ کہ اب کبھی آپ سے ملنے نہ آؤں گی۔ اور آپ جیسے بے وفا کا کبھی دیدار نہ کروں گی۔

دوسرے دن میں آپ کو دیکھنے نہ گئی۔ لیکن تیسرے روز بے قرار ہو کر پھر آپ کے مکان کے سامنے اسی جگہ پہنچ گئی۔ جہاں سردی اور برف بھی میرے قدموں میں لغزش پیدا نہیں کر سکی تھی۔

دوسرے روز جب میں آپ کے مکان کے پاس کھڑی تھی۔ آپ آگئے۔ آپ نے اپنی سحر آلود نگاہیں میری گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ملائیں میں کانپنے لگی۔ آپ مسکرانے لگے اور میرے پاس سے گزر گئے۔ تیسری مرتبہ پھر یہی اتفاق ہوا۔ لیکن آپ نے مجھے مطلق نہ پہچانا۔ آپ نے مجھے اچھی طرح دیکھا ہی نہیں تھا۔ پہچانتے کس طرح؟ بہر حال آپ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میں نے ڈرتے اور کانپتے ہوئے آپ کی باتوں کا جواب دیا۔ آرزوئیں اور امنگیں میرے دل میں تڑپ رہی تھیں۔ آپ نے جب مجھ سے کہا کہ "میرے ساتھ آپ ہوٹل میں چلیں گی؟" تو میں کسی طرح انکار نہ کر سکی۔ بلکہ میں اپنے دل میں بہت خوش ہوئی۔

ہم دونوں ایک ہوٹل میں پہنچے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہم نے وہاں کھانا کھایا جب رات زیادہ ہو گئی۔ تو آپ نے کہا کہ "کیا آپ کو دیر تو نہیں ہو رہی۔ آپ تھوڑی دیر میرے ساتھ باتیں کر سکیں گی۔" میں نے دل میں کہا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں آپ پر نثار ہونے کے لئے تیار ہے۔

آپ بہت متعجب ہوئے کہ میں نے آپ کے ساتھ چلنے کے لئے اتنی جلدی رضا مندی کا اظہار کیوں کر دیا۔ کیونکہ تجربے نے آپ کو بتا دیا تھا۔ کہ کسی عورت کو گھر لیجانے کے لئے کتنی التجائیں، منتیں اور خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں۔ ایک بازاری عورت بھی کسی مرد کے ساتھ جانے کے لئے اتنی جلدی تیار نہیں ہو سکتی۔ جتنی جلدی میں تیار ہو گئی آپ نے میری فوری رضامندی کا یہ مطلب لیا۔ کہ میں ایک ایسی الھڑ لڑکی ہوں جسے دُنیا کے نشیب و فراز سے کوئی واقفیت نہیں۔ آپ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے جہاں برسوں کی آرزوئیں اور تشنہ تمنائیں بر آنے والی تھیں۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

(۱۰)

میں چاہتی تھی کہ اپنی محبت کا راز اپنے سینے ہی میں چھپائے رکھوں۔ میں مطلقاً نہیں چاہتی تھی کہ آپ مجھے پہچانیں یا میرے دلی جذبات سے واقف ہوں۔

آہ! وہ رات کس قدر سیمیں و زریں تھی۔ جو میں نے آپ کے ساتھ گزاری۔ اس سے پہلے مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا تھا۔ آپ نے جی بھر کر میری معصوم اور پاک جوانی سے لطف اٹھایا۔ اس رات آپ نے جو کچھ کیا۔ اس کا الزام میں آپ کو نہیں دیتی۔ میں نے خود اپنے آپکو آپ کے حوالے کیا تھا۔ دوسری صبح جب میں جانے لگی۔ تو آپ نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر میری آنکھوں سے آنکھیں ملائیں۔ شاید آپ مجھے پہچان رہے تھے۔ مگر آپ نے مجھے کبھی اچھی طرح نہ دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ عمر۔ جوانی اور قیمتی ملبوس بھی آدمی کی ہیئت بالکل بدل دیتے ہیں۔ اس لئے آپ مجھے شناخت نہ کر سکے۔ میں خاموش کھڑی رہی۔ آپ نے ایک بلوریں گلدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم ان پھولوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ گی؟"

اس گلدان میں گلاب کے چار سفید پھول تھے۔ جن کی بھینی بھینی خوشبو میرا مشامِ جان معطر کرنے لگی۔ سیمیں و زریں رات کا خمار اور اندوہ فزا خواب میرے جسم میں میٹھی میٹھی چٹکیاں لے رہا تھا۔ میں نے آپ کا شکریہ ادا کر کے وہ پھول لے لئے۔ آپ نے مجھ سے کہا "کل رات بھی آنا۔" میں دوسری رات بھی آپ سے ملی اور تیسری رات بھی۔

تیسری رات آپ نے مجھ سے کہا کہ "میں کسی کام سے وی آنا سے باہر جا رہا ہوں۔" آپ کے اس ارادے کا ذکر سنکر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں تمہیں خط لکھتا رہونگا۔ مجھے اپنا پتہ دے دو۔ میں نے ایک فرضی نام کے ساتھ اپنے شہر

کے پوسٹ ماسٹر کی معرفت پتہ دے دیا۔ لیکن آہ! آپ نے مجھے بالکل بھلا دیا۔ اور کبھی آپ کا کوئی خط نہ پہنچا۔

(۱۱)

کل رات میرا بچّہ ابدی نیند سویا ہے۔ یہ میرا پہلا اور آخری بچّہ تھا۔ یہ بچّہ ہم دونوں کا تھا۔ یعنی یہ آپ کی اولاد تھی۔ مَیں نے کبھی آپ کو اطلاع نہ دی کہ آپ کا لڑکا پیدا ہُوا ہے۔ اگر مَیں ایسا کرتی بھی تو آپ یقین نہ کرتے۔ اور شاید یہ سمجھتے کہ آپ کو ایک امیر آدمی سمجھ کر کسی دوسرے آدمی کے بچّے کے لئے آپ سے خرچ مانگ رہی ہوں۔ مَیں اپنی محبت کی یہ توہین کبھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ نہ مَیں آپ سے کسی قسم کی مالی امداد لینا چاہتی تھی مَیں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ آپ اولاد کے جھمیلے میں پڑ کر پریشان ہوں۔ نہ میں دوبارہ آپ کے سامنے آ کر اپنی الفت کے اس الم انگیز لیکن شیریں نتیجے سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے میں نے اس بچّے کی پیدائش کے متعلق آپ کو کوئی اطلاع نہ دی۔

اکثر مجھے بہت سی مشکلات کا بھی سامنا ہُوا۔ لیکن میں نے اس بچّے کی خاطر آپ سے بھیک مانگنا گوارا نہ کیا۔ اگر مَیں چاہتی تو اپنا جسم دوسرے قدر دانوں کے حوالے کر کے بہت اچھی زندگی بسر کر سکتی تھی۔ لیکن جس جسم کو آپ چھُو چکے تھے اسے کسی دوسرے کے سپرد کر دینا میں دُنیا کا سب سے بڑا گناہ تصور کرتی تھی۔ مَیں اس وقت آپ سے کوئی شکوہ نہیں کر رہی۔ بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ میرے راز کا کوئی حصّہ آپ سے پوشیدہ نہ رہے۔ مَیں ایک ایک بات آپ سے کہہ دینا چاہتی ہوں۔ آپ نے مجھے کوئی خط نہ بھیجا۔ آپ نے مجھے بالکل بھلا دیا۔ لیکن میں نے آپ کو نہیں بھلایا۔ لڑکا ہُو بہُو آپ کا ہمشکل تھا۔ گویا یہ آپ کی دوسری تصویر تھی۔ وُہی آنکھیں۔ وُہی مسکراہٹ۔ وُہی ہونٹ اور وہی پیشانی ــــ

میں دہی آنا کے تھیٹروں، باغوں اور بازاروں میں اکثر آپ کے قریب سے گزرتی تھی۔
لیکن افسوس کہ آپ مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ ایک روز ایک محفلِ رقص میں آپ نے
مجھے دیکھا۔ لیکن اس طرح جیسے ایک اجنبی دوسرے اجنبی کو دیکھتا ہے۔ آپ کو دیکھ کر
میرا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ آپ نے مجھ سے کہا۔ "آپ میرے ساتھ کھانا کھا سکتی ہیں؟"
میں نے کسی قدر توقف اور جھجک کے ساتھ "ہاں" کہہ دیا۔ میں نے پھر آپ کی نظروں میں
پہلی سی اجنبیت اور غیریت دیکھی۔ مگر آہ! آپ کی نظریں کس قدر پُرکشش تھیں۔ میں نے
آپ کے ساتھ کھانا کھایا۔ آپ مجھے باتوں باتوں میں بہلا کر اپنے گھر لے گئے۔ اور میں نے
ایک رنگین اور رومانی رات پھر آپ کے ساتھ گزاری۔ آہ! آپ نے اب بھی مجھے نہ پہچانا
کیونکہ آپ جوان لڑکیوں اور عورتوں کو اپنی مسحورکن آنکھوں سے ورغلا کر اپنے مکان پر
لانے کے اس قدر عادی ہو چکے تھے۔ کہ آپ کو کوئی خاص لڑکی یاد نہ رہ سکتی تھی۔

جس دن میں نے دوبارہ آپ کے ساتھ وصل کی رات بسر کی اُس دن آپ کی
سالگرہ تھی۔ یہ بھی ایک اتفاقیہ بات تھی۔ صبح میں نے دیکھا کہ بلور کے گلدان میں چار سفید
پھول رکھے ہیں۔ میں اُنہیں دیکھ کر زیادہ متعجب نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ وہی پھول تھے۔ جو میں نے
ایک روز پہلے آپ کی خدمت میں بھیجے تھے۔ میں ہر سال آپ کی سالگرہ کی تقریب پر آپ کو
پھول بھیجا کرتی تھی۔ میرا یہ معمول ہو گیا تھا۔ میں ان پھولوں کے ساتھ ایک خط بھی لکھتی تھی۔
کہ "یہ ناچیز تحفہ ایک ایسی گمنام عورت آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہے۔ جو آپ کے افسانوں
اور ناولوں کی مداح ہے"۔ لیکن دراصل یہ پھول میری پہلی رات کی یادگار تھے جو میں نے آپ
کے ساتھ بسر کی اور صبح آپ نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے مجھے پھولوں کا تحفہ دیا۔ میں
اس ہدیہ کو ایک بیش بہا خزانہ سمجھتی اور ہر سال الفت کی یہ یادگار آپ کی خدمت میں بھیجتی

اب آپ نے پھر مجھے وہ پھول پیش کئے۔ میں نے اپنے ہی بھیجے ہوئے پھول ہاتھوں میں لیکر کہا "یہ پھول آپ کو کس نے بھیجے ہیں؟" آپ نے کسی قدر بے پروائی سے جواب دیا "ہر سال کوئی نامعلوم عورت مجھے بھیجتی ہے۔ تم انہیں لے جاؤ۔ یہ میرا تحفہ ہے۔ شاید تم انہی کی وجہ سے مجھے یاد رکھ سکو۔"

آپکا یہ فقرہ سن کر کہ "آپ اس عورت کو نہیں جانتے جو ہر سال یہ پھول بھیجکر آپ کی سالگرہ کی خوشیوں میں اضافہ کرتی ہے۔ میری رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

آپ نے کہا "میں نہیں جانتا وہ کون نیک خاتون ہے۔"

میں نے آپ کو یاد دلانے کے لئے کہا۔ "شاید آپ اس عورت کو جانتے ہوں۔ اور اب بھول چکے ہوں۔"

آپ نے میرے منہ سے یہ جملہ سُنکر میری طرف ذرا غور سے دیکھا۔ اور میری نگاہوں نے آپ سے بار بار التجا کی۔ کہ اپنی داسی کو پہچان لیجئے۔ اس کی محبت کی توہین نہ کیجئے۔ اپنی نیک دل خاتون کو پہچان لیجئے۔"

لیکن افسوس تھوڑی دیر بعد آپ کی آنکھوں سے وہ چمک غائب ہو گئی۔ اور آپ مجھے پھر پہچان نہ سکے۔ میرے لڑکے کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب میرا دُنیا میں کوئی نہیں۔ ہا آپ مجھے دوبارہ نہ دیکھیں گے۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ لیکن اس میں آپکا کوئی قصور نہیں۔ میں نے اُلفت کی۔ لیکن میری الفت کا انداز مجھے راس نہ آیا۔ میں نے بڑے لڑ پن سے آپ سے محبّت کی۔ آپ نے اسے ٹھکرا دیا۔ بہر حال آپ کی الفت مجھے دوسرے جہان میں بھی بے چین رکھے گی۔ ابھی میری روح پرواز کر جائے گی۔ اور آپ میرا اصلی نام تک نہ معلوم کر سکیں گے۔

میرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اس کی قوت سلب ہو چکی۔ اب میں زیادہ نہیں لکھ سکتی۔ لرزے کے تپ نے مجھے نڈھال کر دیا ہے۔ ہوش و حواس جواب دے چکے ہیں۔ دل تو پہلے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں رہ رہ کے مجھے خیال آ رہا ہے کہ آپ کی اگلی سالگرہ پہ گلاب کے سفید پھول کون بھیجے گا؟"

یہ پھول میری زندگی کی آخری نشانی تھی۔ پیارے! آپ سے میری پہلی اور آخری التجا ہے کہ ہر سال اپنی سالگرہ کے موقع پہ گلاب کے چند سفید پھول اس گلدان میں رکھ لیا کرنا۔ میری روح کی آمد اپنے شبستان میں محسوس کیا کرنا مجھے بھول جانا۔ لیکن اپنے گلدان میں پھول رکھنا نہ بھولنا۔ مجھے بھول جانے سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اگر آپ نے میری التجا منظور نہ کی۔ تو دوسری دنیا میں میری روح آپ کے تغافل کی شکوہ سنج رہے گی۔ میں آپ کی عنایتوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ کے تغافل، اجنبیت اور بے خبری پر آج میں قربان ہو رہی ہوں۔ یہ چند اوراق خط کی صورت میں قبول ہوں۔ الوداع! میرے پیارے الوداع!

(۱۲)

گمنام عورت کا نامۂ الفت افسانہ نویس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نیچے گر گیا۔ اور وہ کرسی پر اس طرح بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ جیسے کوئی مرمریں مجسمہ ہو۔ اب تمام واقعات اس کے ذہن میں ایک ایک کر کے آ رہے تھے۔ پہلے اس کے تصور میں اپنی ہمسائی کی نوخیز لڑکی کا نقشہ آ گیا۔ اس کے بعد اس نے تصور میں اس عورت کو دیکھا جسے وہ اپنے ساتھ اپنے شبستان میں لے گیا تھا۔ پھر اس نے تصور کی آنکھ سے اس عورت کو دیکھا جسے اس نے ایک محفل رقص سے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ آہستہ آہستہ تمام حالات کا عکس اس کے آئینہ تصور میں صاف ہوتا گیا۔ کوئی سحر انگیز قوت اس کے ذہن کو لحظہ بلحظہ زیادہ روشن

کرنے لگی۔ اس کے سینے میں جذبات نے ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ انفعال اور تغافل عشق کی المناک تصویریں اس کے سامنے آگئیں۔

آج اس کی سالگرہ تھی۔ اس نے گلدان پر ایک گھبرائی ہوئی نگاہ ڈالی۔ آہ! وہ گلدان جو ہر سالگرہ کے موقع پر بھرا رہتا تھا۔ آج خالی تھا۔ آج دنیا سے وہ ہستی اٹھ گئی تھی۔ جو ہر سال اسے پھول بھیجا کرتی تھی۔

مصنف نے ایک آہ سرد بھری ــــ اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔

"اُف سفید گلاب! میری پیاری ازبیلا! میں نے تجھے پہچان لیا۔ ہمیشہ کے لئے میں نے تجھے سمجھ لیا۔ میں بھی تیرے پاس آتا ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

مصنف اس کے بعد اپنی کرسی پر سے نہ اٹھا ــ اس کے سامنے ایک حسین عورت کھڑی تھی۔ جنت کی حور کی طرح مقدس ــــ اس کے پاس ہی اس کا بچہ کھڑا تھا۔

مصنف نے اس کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ گمنام عورت کا خط مصنف کے سینہ پر تھا۔ اور اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ آسمان کا دریچہ کھلا۔ اور یکے بعد دیگرے تین روحیں بہشت بریں کی طرف قدم اٹھاتی نظر آئیں۔

(استفہین اریونگ)

سرما کی ایک رات

موسم خزاں کی ایک تاریک کا ذکر ہے کہ مَیں انتہائی بیقراری اور بےچینی کی حالت میں پھر رہا تھا۔ جس شہر میں مَیں اب وارد ہُوا تھا۔ وہاں میرا ایک بھی واقف نہ تھا۔ میری جیب میں پھُوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ اور رات گزارنے کے لئے مجھے کوئی جگہ نہ ملی تھی۔

اس شہر میں پہلے چند روز تو مَیں نے اپنا چغہ اور چاندی کے دو بٹن بیچ کر بسر کئے۔ پھر میں شہر کو خیرباد کہہ کر آبادی کے اس حصّے میں چلا آیا۔ جہاں بڑی بڑی کشتیوں اور جہازوں کے ٹھیرنے کے لئے ایک گھاٹ بنا ہُوا تھا۔ اس جگہ جہاز رانی کے زمانے میں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ مگر اب یہاں چاروں طرف خاموشی چھائی تھی۔ سنسانی اور ویرانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

گیلی گیلی ریت پر اپنے پیروں کو گھسیٹتے ہوئے مَیں تن تنہا مکانوں اور گوداموں میں گھوم رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا۔ کہ کاش یہاں سے کچھ کھانے کو مل جائے۔ موجودہ تہذیب و تمدّن کو دیکھ کر ہمارا دل تو خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن پیٹ نہیں بھرتا۔

اس کے لئے ایک غریب آدمی کو بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ بازاروں میں جاؤ۔ تو تمہیں عالیشان عمارتیں نظر آئیں گی۔ ان کا فن تعمیر اور ان میں بسنے والوں کا جاہ و جلال ان کے عمدہ عمدہ گرم لباس دیکھ کر تم بیسویں صدی کے حیرت انگیز کارناموں کی داد ضرور دو گے۔ لیکن یہ سب چیزیں غریبوں کے لئے بیکار ہیں۔ ان چیزوں سے غریبوں کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

شام کا سایہ بڑھتا چلا آتا تھا۔ موسلا دھار بارش بھی ہونے لگی ——— سردیوں کے دن تھے۔ اور شمال کی طرف سے تیز و تند ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ خالی بیٹھکوں اور دکانوں میں ہوا کے گذرنے سے چیخوں کی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ دریا کی پُرشور لہریں ریتیلے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور ہوا کے طمانچوں سے کف آلودہ ہو جاتی تھیں۔ پھر اچھل اچھل کر گرتی۔ اور ایک دوسری کے پیچھے بھاگتی ہوئی دھندلی دوریوں میں غائب ہو جاتی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دریا جاڑے کی شکل دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ کہ کہیں شمال کی برفانی ہوا اپنی بیڑیاں آج ہی رات اس کے پاؤں میں نہ ڈال دے۔ آسمان بوجھل اور تاریک ہو رہا تھا۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے مسلسل گر رہے تھے۔ فطرت کا غمناک گیت بید مجنوں کے دو بوڑھے درختوں اور ایک ادھ ڈوبی پڑی ہوئی کشتی کی موجودگی سے جو ان درختوں سے بندھی تھی اور بھی زیادہ غم انگیز ہو گیا تھا۔ الٹی کشتی کا پیندا پھٹ چکا تھا۔ دونوں بوڑھے درخت خراب و خستہ حال ہو رہے تھے۔ اور ان کے پتے سردی۔ بارش اور تیز و تند آندھیوں کی نذر ہو گئے تھے۔ ہر وہ چیز جو اس وقت میرے سامنے تھی۔ بدحال، بے جان اور غم آفرین معلوم ہو رہی تھی اور ان بھیانک نظاروں کو دیکھ دیکھ کر آسمان کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ ہر چیز تیرہ و تار سا اور

سیاہ نظر آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سب چیزیں مر چکی ہیں۔ اور اس دنیا میں اس وقت صرف میں ہی زندہ ہوں لیکن سردی مجھے بھی موت کی آغوش میں کھینچ رہی ہے اس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ آہ جب مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں گیلی ریت پر دور تک چلا گیا۔ سردی سے میرے دانت بج رہے تھے۔ اور مارے بھوک کے پیٹ میں چوہے ناچ رہے تھے ایک جگہ میں جلی ہوئی دکانوں کے قریب خالی الماریوں کے پیچھے کوئی کھانے کی چیز تلاش کر رہا تھا۔ کہ یکایک میری نظر ایک انسانی صورت پر جا پڑی۔ یہ ایک عورت تھی۔ اس کا نسوانی لباس بارش سے بھیگ کر اس کے جھکے ہوئے کندھوں سے لگ گیا تھا۔ میں چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا کہ وہ کیا کر رہی ہے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنے ہاتھوں سے ریت میں کوئی گڑھا کھود رہی ہے میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "تم کیا کر رہی ہو؟"

میرے یکایک بولنے سے وہ کچھ چونک سی گئی۔ اور اس کے منہ سے زور کی ایک چیخ نکل گئی۔ دفعتہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اپنی نیلی نیلی خوبصورت اور خوفزدہ آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس لڑکی کی عمر میری ہی عمر کے برابر تھی۔ اور اس کے سرخ و سپید چہرے کو تین نیلے نیلے داغوں نے گہنا رکھا تھا۔ اگرچہ ان داغوں کی تقسیم نہایت مناسب اور موزونیت کیساتھ ہوئی تھی پھر بھی انہوں نے اسکے حسن کو چھپا دیا تھا۔ ہر داغ ایک دوسرے کے برابر تھا دو آنکھوں کے نیچے تھے اور ایک جو کسی قدر بڑا تھا پیشانی پر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس لڑکی کے چہرے کو کسی ایسے آدمی نے داغدار بنا دیا ہے۔ جو حسن کا بہت بڑا دشمن ہو۔

نوخیز حسینہ میری طرف دیکھتی رہی اور رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں سے وحشت اور سراسیمگی

مفقود ہونے لگی۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر سے ریت جھاڑی اور اپنے سر کے سُوتی رُومال کو دوبارہ ترتیب کے ساتھ باندھ کر بولی "میں سمجھتی ہوں کہ تم بھی میری طرح بھوکے ہو اور تمہیں بھی کھانے کے لئے کچھ چاہیئے۔ ذرا اس جگہ کو اپنے ہاتھوں سے کھود کھود کر بہت تھک گئی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے سر کی جنبش سے ایک دکان کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگی۔

"اس دکان میں ضرور ہمیں روٹی اور سالن مل جائیگا۔ یہ دکان ان دنوں بھی کھلی رہتی ہے۔ دوسری دکانیں اُجڑ چکی ہیں۔ تم اس جگہ کھودتے جاؤ تاآنکہ لکڑی کی دیوار ختم ہو جائے۔ اور ہم دیوار کے نیچے سے رینگ کر دکان میں جا گھسیں اور کھانے پینے کا سامان باہر نکال لائیں۔

چنانچہ اب میں اپنے آہنی ہاتھوں سے ریتلی زمین کھودنے لگا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔ اور مجھے کام میں مدد دینے لگی۔ ہم نے نہ جانے کتنی دیر خاموشی سے اپنا کام جاری رکھا۔ اس وقت جرم۔ قانون۔ چوری اور جیل کے تمام نتائج میرے تصوّر میں تھے۔ لیکن مجھے بھوک نے اسقدر نڈھال کر رکھا تھا کہ میں اس وقت بڑے سے بڑا گناہ کرنے کے لئے بھی تیار تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی حسین رفیقہ کی امداد اور مشورے بھی حاصل تھے۔ پھر میں کیوں نہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے پوری پوری کوشش کرتا۔

شام کا سایہ پھیل چکا تھا۔ چاروں طرف تاریکی بڑھ چکی تھی۔ مرچوں کا بورا اب زیادہ بلند ہو گیا تھا۔ لیکن مینہ کے چھینٹے اب الماری اور لکڑی کی دیوار پر زیادہ زور شور سے پڑ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں اِدھر اُدھر سے پہرہ داروں کی مہیب آوازیں سنائی دینے لگیں۔

وہ پوچھنے لگی۔" آخر لکڑی کی اس دیوار کی کوئی بنیاد بھی ہے۔ کیا ہمارا کام کبھی ختم بھی ہوگا۔؟"

اس نے یہ فقرہ کچھ اس قدر آہستگی سے کہا کہ میں نہ سن سکا۔ اس لئے میں خاموش رہا اس کے بعد وہ دوبارہ بولی "آخر اس دیوار کی کوئی انتہا بھی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم زمین کھودتے جائیں۔ اور لکڑی کی دیوار کی بنیاد کبھی آئے ہی نہیں یا ممکن ہے کہ دکان کا فرش پکا ہو۔ اس صورت میں بھی ہماری تمام محنت اکارت جائے گی۔ بہتر ہے کہ ہم دکان کا تالا توڑ ڈالیں۔"

عورتوں کو اچھے خیال شاذ و نادر ہی سوجھتے ہیں۔ لیکن جب سوجھتے ہیں۔ تو کمال ہو جاتا ہے۔ میں اچھے خیالات اور بہتر آراء کا ہمیشہ قدر دان رہا ہوں۔ اور حتے الامکان ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔ چنانچہ میں نے تالے کو پکڑ کر اس زور سے مروڑا جھنجوڑا کہ وہ کنڈی سمیت میرے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ جھپٹ کر دکان میں جا داخل ہوئی۔ اور خوش ہو کر کہنے لگی "تم تو شیر ہو شیر!" اور دکان کی تلاشی لینے لگی۔

آج کل تو میری یہ حالت ہے۔ کہ کسی عورت کا چھوٹے سے چھوٹا تعریفی فقرہ مردوں کے بڑے بڑے قصیدوں سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ مگر ان دنوں میری رگوں میں جوانی کا خون گردش کر رہا تھا۔ اور میرے مزاج میں بہت اکھڑپن تھا۔ جس کی اب اصلاح ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس کی تعریف و تحسین پر کان نہ دھرتے ہوئے میں نے نہایت بے تابی کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

"کہو۔ دکان میں کوئی کھانے کی چیز ہے بھی یا نہیں؟" اور وہ ایک بے کیف آواز کے ساتھ سب چیزوں کو گننے لگی "یہاں تو ٹوکری بھر بوتلیں کچھ پوستینیں ایک چھتری اور لوہے کی صرف ایک کڑاہی ہے۔ لیکن سب کی سب چیزیں خالی ہیں۔"

اس کے منہ سے یہ فقرہ سنکر میری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ لیکن یکایک وہ خوشی سے چلا اٹھی۔ "آہاہاہا! یہ لو روٹی نکل آئی۔ لیکن یہ ذرا بھیگی ہوئی ہے۔"
اس نے روٹی میری طرف باہر پھینک دی اور خود بھی باہر نکل آئی۔ اس کے آنے تک میں نے ایک بڑا سا لقمہ توڑ کر اپنے منہ میں ڈال لیا تھا اور اسے چبا رہا تھا.....
"ارے اس میں سے مجھے بھی تھوڑی سی دو.... ہاں ہمیں اب یہاں نہیں ٹھیرنا چاہئے لیکن ہم جائیں کہاں؟" وہ ہر طرف اپنی مستفسرانہ نگاہیں دوڑانے لگی۔ فضا میں تاریکی ہی تاریکی۔ پانی ہی پانی اور شور ہی شور تھا۔
"دیکھو وہ ایک ٹوٹی ہوئی کشتی پڑی ہے۔ آؤ وہاں چلیں۔"
"چلو چلو!" کہہ کر ہم دونوں کشتی کی طرف چل پڑے۔ میں نے "مال غنیمت" کا نصف حصہ اسے دیدیا تھا۔ اور ہم اس سادہ سی خشک روٹی کو نہایت مزے سے کھا رہے تھے بارش اور تیز ہوگئی۔ دریا کے بہاؤ میں سے بجلی کی کڑک کی سی تیز آواز سنائی دینے لگی۔ سوخت سیٹیاں بجانے لگے۔ اندھا ریکی میں طوفان کا بھوت ناچنے اور شور مچانے لگا۔
میں اپنی روٹی کھا رہا تھا۔ اور میری رفیقہ بھی میرے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے بڑے حریصانہ انداز سے اپنی روٹی نگل رہی تھی۔
میں نے ابھی اس کا نام دریافت نہ کیا تھا۔ اب میں نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"
وہ کہنے لگی "میرا نام ساشا ہے۔"
میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ میرے دل میں زور سے درد کی ایک ٹیس اٹھی لیکن میں نے پھر اپنی نگاہیں رات کی تاریکی میں جذب کرلیں۔ اور مجھے ایسا معلوم

ہونے لگا۔ جیسے میری قسمت کی بدصورت دیوی میری طرف دیکھ دیکھ کر نہایت بھیانک انداز سے مسکرا رہی ہے۔

مینہ کے چھینٹے کشتی پر تازیانوں کی طرح پڑ رہے تھے۔ بارش کی مسلسل آواز۔ غم انگیز خیالات کو برانگیختہ کر رہی تھی۔ جب ہوا کشتی کی ایک درز میں سے ہوتی ہوئی اس کے ٹوٹے ہوئے پیندے میں داخل ہوتی تھی۔ تو اس میں سے ایک عجیب المناک اور یاس انگیز آواز نکلتی تھی۔ جب دریا کی لہریں آ آ کر ساحل سے ٹکراتیں تو ان کی بھیانک آواز دل کو لرزا دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ لہریں کوئی رنجیدہ اور ناقابل بیان کہانی سنا رہی ہیں لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس کہانی کو پوری طرح سنا سکیں۔ اور وہ اُسے پورا کئے بغیر واپس بھاگ جانا چاہتی ہیں۔ بارش کی آواز دریا کی آواز سے ملکر ایک مسلسل آہ بن رہی تھی۔ جو اس وقت اندھی کشتی کے اوپر فضا میں تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہوا سنسان اور کف آفریں دریا کے سینے پر فرط اضطراب سے لوٹ رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ کوئی المناک راگ بھی گاتی جاتی تھی۔

ہم دونوں بڑی بے آرامی کی حالت میں الٹی کشتی کے نیچے بیٹھے تھے۔ ہم دونوں کیلئے یہ جگہ کچھ تنگ سی تھی۔ اس کے شکستہ پیندے میں بارش کے چھوٹے چھوٹے سرد قطرے نیچے ٹپک رہے تھے۔ اور ہوا کے سرد جھونکے اندر آ آ کر ہمیں چھیڑ رہے تھے۔ ہم خاموش بیٹھے سردی سے کانپ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم سونے کی فکر کرنے لگے۔ ساشا کشتی سے سہارا لگائے گچھم گچھا ہو کر ایک چھوٹی سی گیند بن گئی تھی۔ اور اپنی باہوں کو اپنے گھٹنوں کے گرد لپیٹے ہوئے اور ٹھوڑی کو گھٹنوں پر ٹکائے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دریا کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے سفید چہرے پر نیلے داغوں کی وجہ سے اور بھی زیادہ بڑی

معلوم ہو رہی تھیں۔ اور وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اس کے اس سکون و سکوت سے میں خوفزدہ ہونے لگا۔ میں اس باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ اپنی بات کس طرح شروع کروں۔

آخر اسی نے گفتگو کی ابتدا کی۔ اور کہنے لگی "زندگی ایک دُکھ ہے" ــــ یہ الفاظ اس نے نہایت صفائی، یکسوئی اور یقین کے لہجے میں کہے۔ لیکن شکایت نہ تھی ان الفاظ کو کچھ ایسی بے اعتنائی سے ادا کیا گیا تھا۔ کہ ان میں شکایت کا شائبہ تک معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس سادہ اور معصوم روح لڑکی نے زندگی پر اپنی سمجھ کے مطابق غور کیا تھا۔ اور ایک خاص نتیجے پر پہنچکر اسے ایک چھوٹے سے فقرے سے آشکار کر دیا تھا۔ میں اس کی بات کی تردید نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اگر میں ایسا کرتا تو یہ خود میرے ہی دلی خیالات کی تردید ہوتی۔ لہٰذا میں اس کی بات سن کر خاموش بیٹھا رہا۔ اور وہ بھی بدستور بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

"کیا ہوگا"۔ اگر ہم زندگی کو بُرا بھی کہدیں۔" اس نے پھر کہا۔ اور اس مرتبہ بھی اس کے لہجے میں شکایت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ زندگی کے متعلق ایسے خیالات کے اظہار کے وقت اس کے پیش نظر اس کی اپنی ذات تھی۔ اور اپنے آپ کو تضحیک و استہزا سے بچانے کے لئے اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خود اس زندگی کا مضحکہ اڑائے۔

لیکن اس قسم کے خیالات کا سلسلہ میرے لئے ناقابل بیان طور پر غم انگیز اور دردناک تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت خاموش رہا۔ تو میں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگونگا۔ اور ایک عورت کے سامنے یہ حرکت میرے لئے نہایت

شرمناک تھی۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ وہ خود مصائب زندگی سے گھبرا کر رو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے باتیں کرنے کا ارادہ کیا۔

جب اس نے اپنے پٹ جانے کا ذکر کیا۔ تو میں نے اس سے پوچھا۔ کہ "وہ کون شخص تھا جس نے تمہیں پیٹا؟"

"یہ سب پاشکا کی مہربانی ہے۔" وہ نہایت سادہ لوحی سے کہنے لگی۔

"اور وہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ نانبائی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا وہ تمہیں اکثر پیٹتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ کہنے لگی: "ہاں۔ جب کبھی وہ شراب کے نشے میں ہوتا ہے۔ تو وہ مجھے خوب پیٹتا ہے۔"

اب یکایک وہ پہلے سے بھی میرے قریب آگئی۔ اور اس نے اپنے اور اپنے محبوب پاشکا دونوں کے آپس کے تعلقات کے متعلق مجھ سے باتیں کرنی شروع کیں۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک نانبائی تھا۔ اس کی مونچھیں سرخ رنگ کی تھیں۔ اور وہ بہت اچھا ستار بجاتا تھا۔ وہ اکثر اس سے ملنے آتا۔ اور وہ اس سے مل کر بہت خوش ہوا کرتی۔ کیونکہ یہ خوش طبع لونڈا بہت اچھا لباس پہنتا تھا۔ اس کے پاس ایک واسکٹ بھی تھی۔ جس کی بنوائی پر اس نے پندرہ روبل خرچ کئے تھے۔ اس کا بوٹ نہایت نفیس مخمل کا تھا۔ یہ تھیں وہ تمام باتیں۔ جنہوں نے اس بے چاری لڑکی کا دل چھین لیا تھا۔ اور یہ بیچاری ہر طرح سے اس نوجوان پر اعتبار کرنے کیلئے مجبور ہو گئی تھی۔ چنانچہ اسی اعتبار کی بنا پر وہ اس سے وہ تمام نقدی چھین لے جاتا جو اسے گھر سے ملتی۔ لیکن وہ

اس بات کی ذرہ بھی پرواہ نہ کرتی۔ اگر وہ اسکی آنکھوں کے سامنے دوسری لڑکیوں کے پیچھے نہ بھاگتا پھرتا۔

وُہ کہنے لگی۔ کیا یہ میری توہین نہیں تھی کہ وہ مجھے چھوڑ کر دوسری لڑکیوں کا تعاقب کرتا پھرے۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ میں شکل و صورت میں دوسری لڑکیوں سے کس طرح کم نہیں۔ کتنا نابکار ہے وُہ۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کہ میں اپنی مالکہ سے اجازت لیکر تھوڑی دیر کیلئے اس کے پاس گئی۔ وہاں میں نے ایک عجیب سین دیکھا۔ اس نے اپنی محبوبہ ڈُمسکا کو اپنے پلنگ پر لٹا رکھا تھا۔ اس حالت میں کہ اس کے جسم اور اُبھرے ہوئے سینہ پر کپڑے کی ایک دھجی تک نہ تھی۔ اگر میں پہنچنے میں تھوڑی دیر کرتی۔ تو اس دوشیزہ کا پردۂ عصمت کبھی کا چاک ہو چکا ہوتا چنانچہ مجھے جونہی ایک عورت کی دو سفید عریاں رانیں دکھائی دیں۔ تو میں دُور ہی سے سمجھ گئی۔ کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ اندر جا داخل ہوئی۔ اور ڈمسکا کو جو شراب کے نشے میں بدمست تھی۔ جا کر اسکی چوٹی سے پکڑ لیا۔ اور اس کے سینے کو مارے غصہ کے اس طرح نوچا اور کھسوٹا کہ جسطرح مالی پھول لیچتا ہے۔ اور اسے دھکا دیکر پرے گرا دیا۔ پھر میں نے پاشکلس سے کہا۔ او نابکار! تو یہ کیا حرکت کرنے والا تھا۔ تو بڑا کمینہ شخص ہے۔ کہ ہر وقت لڑکیوں سے اپنا جسم گرماتے رہتا ہے۔ کیا تجھے کوئلوں کی انگیٹھیاں نہیں مل سکتیں ملعون؟"

میں نے آتش رشک میں جل کر اس سے اتنی بات تو کہہ دی۔ لیکن اس نے مجھے اس صاف گوئی کی بڑی سزا دی پہلے تو وہ عریاں ڈمسکا کو اپنی گود میں اُٹھا کر اندر کے کمرے میں لے گیا۔ میں باہر کھڑی انتظار کرتی رہی۔ اس کے بعد وہ آیا اور مجھ پر برس پڑا۔ لاتوں اور مکوں سے اس نے میرا بُرا حال کر دیا۔ اور مجھے بالوں سے پکڑ کر فرش پر گھسیٹا۔ لیکن یہ سب کچھ اس بات کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ جو بعد میں ہوئی۔ اس نے میرے

وہ مردوں کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ لیکن اس کے بُرا بھلا کہنے میں کوئی کدورت کوئی دشمنی اور کوئی نفرت نہ تھی۔ اس کی گفتگو کا لہجہ کسی طرح بھی اس کے موضوع کا ہم آہنگ نہ تھا۔ کیونکہ اس میں کامل سکون تھا۔ اور اس کی آواز کا سُر خطرناک طور پر دھیما تھا۔ مگر ان سب باتوں نے مجھ پر اتنا اثر کیا۔ کہ قنوطیت کی بڑی سے بڑی کتابیں اور قنوطیت پرستوں کی لمبی لمبی تقریریں بھی نہ کر سکیں گی۔ اب تک میں ایسی کتابیں پڑھ چکا تھا۔ لیکن آج میں ایک بھوک سے نڈھال اور اس زندگی سے تنگ آئی ہوئی تباہ حال عورت کی باتیں خود سن رہا تھا۔ آج میں ایک ایسی عورت کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس لئے شاید مجھ پر اس کی باتوں کا زیادہ اثر ہُوا۔

اب مَیں اپنی حالت کو پہلے سے ابتر محسوس کرنے لگا۔ اور سردی کی شدت کی وجہ سے کراہنے اور دانت کٹکٹانے لگا۔ عین اس وقت دو چھوٹے چھوٹے نرم نازک ہاتھ میری طرف بڑھے۔ ایک میری گردن میں حائل ہو گیا۔ اور دوسرا میرے چہرے پر آ لگا۔ اور ساتھ ہی کسی نے نہائیت خکرمند شیریں اور دوستانہ آواز میں پوچھا "تمہیں کیا چیز دُکھ پہنچا رہی ہے؟"

مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے مجھ سے یہ سوال کرنے والی ناتاشا نہیں۔ بلکہ کوئی اور ہے۔ کیونکہ ناتاشا نے ابھی ابھی تمام مردوں کو بے حمیت ظاہر کیا تھا اور اُنکو تباہ و برباد کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن اب وہی ایک مرد کی حمائیت میں تیزی سے بول رہی تھی۔

"تمہیں کونسی چیز دُکھ دے رہی ہے؟" کیا تم سردی محسوس کر رہے ہو؟ کیا تم ٹھٹھر رہے ہو؟ آہ تم یوں ایک ننھے اُلّو کی طرح بیٹھے ہوئے کتنے عجیب معلوم ہو رہے ہو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ تمہیں سردی ستا رہی ہے..... آؤ یہاں لیٹ جاؤ.....

میں بھی تمہارے ساتھ لیٹ جاؤں گی .... ہاں ہاں ..... یوں ہی اپنی باہیں میرے
گرد حمائل کرلو ..... ہاں ذرا کس کر ..... تم بہت جلد گرم ہو جاؤ گے ..... اور پھر ہم
ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کرکے سو جائیں گے ..... رات بہت جلد گزر جائے گی۔
..... تم دیکھنا یہ کتنی جلدی گذر جائے گی ...... میں کہتی ہوں .... کیا تم بھی
شراب پیا کرتے ہو ..... کیا تم سے بھی کام چھن گیا ہے؟ ...... کیا تمہیں بھی اپنی
نوکری پر واپس جانے کی کوئی امید نہیں؟ .... نہیں۔ نہیں۔ تم قطعاً اس بات
کی پرواہ نہ کرو .... میرے سینے کے ساتھ زور سے اپنا سینہ لگالو ....
اور میرے رخسار، اپنے رخساروں پر رکھ لو ...... "

اس لڑکی نے مجھے آرام پہنچایا۔ اور ہر طرح سے میری ہمت بڑھانیکی کوشش کی۔
لعنت ہو میری اس زندگی پر! میری اس مصیبت میں مصائب کی ایک دنیا
مضمر تھی .... ذرا تصور کرو۔ کہ میں جو انسانیت کے انجام پر نہائیت سنجیدگی سے غور کرنے
میں مصروف رہتا تھا۔ نظام تمدن کو ازسرِ نو ترتیب دینے کی تجویزیں سوچتا تھا۔ سیاسی
انقلابات کے خیالات اپنے دماغ میں بسایا کرتا تھا۔ ان کتابوں کو پڑھا کرتا تھا۔
جنہیں شیطانی حکمت و فراست سے لکھا گیا ہے۔ اور جن کی انتہاء گہرائی تک خود
ان کے مصنفین کا دماغ بھی نہ پہنچ سکا ہوگا۔ میں جو اپنی تمام تر قوت سے کوشش
کر رہا تھا۔ کہ اپنے آپ کو ایک ذی اختیار عملی اشتراکی طاقت بناؤں۔ بلکہ یہ محسوس کر رہا
تھا۔ کہ میں نے ایک حد تک اپنے مقصد کی تکمیل کرلی ہے۔ میں جو اپنے خیال میں
اس مقام تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں میرے خیال کے مطابق مجھے زندہ رہنے کا ایک
امتیازی حق حاصل تھا۔ اور مجھ میں وہ عظمت موجود تھی۔ جو میرے اس حق کو ثابت کرتی

تھی ۔ میں سوچ رہا تھا ۔ کہ میں جو دنیا کے عظیم الشان کارناموں میں ایک اور کارنامے کا اضافہ کرنے کے قابل ہوں ۔ یہاں کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوں اور ایک عورت مجھے اپنے جسم کی حرارت سے گرمی پہنچا رہی ہے ۔ ۔ ۔ ایک مفلوک الحال بے سر و سامان ستائی ہوئی ہستی جس کی حرمہ حیات میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی ۔ اور جس کی مدد کرنے کا مجھے خیال تک نہ آیا تھا ۔ یہاں تک کہ اس نے خود میری مدد کی ۔ اور اگر مجھے مدد کا خیال سوجھ بھی جاتا تو کم از کم میں یہ کبھی نہ جان سکتا ۔ کہ وہ کیونکر کی جائے ۔

میں یہ ماننے پر تیار تھا کہ میں اس وقت کوئی خواب دیکھ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ناخوشگوار اور غم انگیز خواب ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن بارش کے سرد سرد قطرے جو مجھ پر پڑ رہے تھے ۔ اس بات کی فوراً تردید کر دیتے ۔ وہ مجھے سردی سے چھپا رہی تھی ۔ اس کی گرم گرم سانس میرے منہ سے چھو رہی تھی ۔ اور اس کے دل کی ننھی ننھی دھڑکن میرے سینے کو محسوس ہو رہی تھی ۔ باہر ہوا غل مچا مچا کر ناچ رہی تھی ۔ بارش کے قطرے تیروں کی طرح کشتی پر پڑ رہے تھے ۔ لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں ۔ اور ہم دونوں سردی سے اکڑے ہوئے اور کانپتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے ۔ اس ساری کیفیت پر مجاز کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا ۔ اور مجھے یقین ہے کہ آج تک کسی نے ایسا گرانبار اور ہولناک خواب نہ دیکھا ہوگا ۔ جیسی یہ حقیقت تھی ۔

ناشا لگاتار اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملاطفت اور ہمدردی کی باتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسی صرف عورتیں ہی کر سکتی ہیں ۔ اس کی آواز اور الفاظ کے اثرات ایک ہلکی سی آگ کی طرح میرے سینے میں سلگنے لگے ۔ اور میرا دل پگھلنے لگا ۔

میری آنکھوں سے طوفانِ باراں کی طرح آنسو بہنے لگے۔ جنہوں نے بہت سی برائیوں اور حماقتوں اور بہت سے غموں کی گرد کو میرے دل سے دھو ڈالا۔ جو اس رات سے پہلے اس پر جم رہی تھی ......
ساتاشا مجھے تسلی دے رہی تھی۔

"بس بس! ننھے میاں! اب چپ ہو جاؤ..... جانے بھی دو.......
چپ ہو جاؤ..... خدا تمہیں اور موقع دیدیگا ..... تم اپنی اصلاح کرلوگے ...
اور پھر اپنے حقیقی مقام کو پہنچ جاؤگے....... سب کام اچھے ہو جائیں گے........"

وہ مجھے چومتی جاتی تھی..... جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو چومتی ہے ......
بے نفس اور بے غرض ہو کر۔

"بس اب چپ ہو جاؤ...... مجھے تمہاری صورت دیکھ کر ہنسی آ رہی ہے....
صبح ہو جانے دو...... میں خود تمہارے لئے کوئی جگہ تلاش کرلوں گی ....
اگر تمہیں نوکری نہیں ملتی تو کوئی فکر نہ کرو........"

اس کی یہ پُرسکون اور ہمت افزا سرگوشیاں میرے کانوں میں اس طرح گونج رہی تھیں۔ جیسے کوئی خواب ہو۔

صبح ہونے تک ہم وہیں پڑے رہے.......

جب صبح ہوئی تو ہم کشتی کے نیچے سے باہر نکلے اور شہر کو چلے گئے.......
پھر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت دوستانہ طریقے سے الوداع کہی اور اس کے بعد پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ گو پورے چھ ماہ تک میں نے اپنی اس ہمدرد رفیقہ کے لئے شہر کا کونا کونا چھان مارا۔ جس کے ساتھ میں نے خزاں کی ایک رات بسر کی تھی

اس کا چال چلن کس قدر مضبوط تھا...... اگرچہ وہ ایک جاہل لڑکی تھی۔ اور میں ایک پڑھا لکھا ادیب تھا۔ میں اپنے جذبات پر قابو پا سکتا تھا۔ لیکن میں حیران تھا کہ یہ لڑکی جو اس قدر شوخ اور بیباک تھی کہ مجھے گرم کرنے کے لئے اپنے سینے سے لگاتی تھی۔ اور میرے ٹھٹھرے ہوئے ہونٹوں کو گرمی پہنچانے کے لئے تمام رات ان کے بوسے لیتی رہی۔ مگر کس طرح مجھے وصل کا شربت پلائے بغیر چلی گئی...... اس نے اپنے جذبات پر کس طرح قابو پا لیا۔

اگر وہ مر چکی ہے ــــ اور اس کے لئے اگر وہ مر چکی ہے تو اچھا ہی ہے ــــ میری دعا ہے کہ وہ نہایت امن و سکون کے ساتھ ابدی نیند سوئی رہے اور اگر وہ زندہ ہے۔ تو پھر بھی میں یہی کہوں گا۔ کہ اس کی روح پر سلامتی ہو۔ اور اس کی روح کو کبھی دنیا کی پستی کا احساس نہ ہو۔

(میکسم گورکی)

اردلی

اُنہیں اکٹھے رہتے ہوئے چار سال گذر چکے تھے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی ان دونوں میں سے کسی ایک کے دل سے یہ خیال محو نہیں ہوا تھا۔ کہ ایک افسر ہے اور دوسرا سپاہی۔ اگر پہلا فوجی تحکم کی زندہ تصویر تھا۔ تو دوسرا اطاعت شعاری میں اپنا جواب آپ تھا ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبّت تھی۔ ایسی خاموش محبت جو ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ دلوں کے پردوں میں مستور رہتی ہے۔ اور اس کی شدّت میں بھی شیریں لطافت و نزاکت کا ایک طوفان پنہاں رہتا ہے۔ ایسی محبت جب شرمندۂ اظہار ہو جائے تو وہ ایک شگفتہ کلی کی طرح مرجھا جاتی ہے۔ ایسی محبّت تو ہونٹوں کو چبا چبا کر اور آنسوؤں کو دبا کر اپنی کمزوری، اور ذکاوتِ حس کو چھپانے کی عادت ہوتی ہے۔

ان دونوں نے مختصر گوئی کی خوب مشق کر رکھی تھی۔ اور وہ ایک دوسرے کی بات کو ایک لفظ، ایک نظر، بلکہ ایک اشارے ہی سے سمجھ لیتے تھے۔ وقت ہی اُن کی گفتگو کی تشریح کرتا جو اُن کے افعال و اقوال کو نہایت پابندی سے توسینے پہلے آتا تھا۔

"آقا میرے لئے کوئی اور حکم؟"

"نہیں"

"میں جا سکتا ہوں؟"

"ہاں جاؤ"

یہ تھا ان کی روزانہ نشست و برخاست کا معمول۔ اس گفتگو میں کبھی ایک لفظ کا بھی اضافہ نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح دن، مہینے اور سال گذرتے گئے۔ یہاں تک کہ چار سال گذر گئے۔ کوارٹروں میں، گھر میں، کیمپ میں، سفر میں اور جنگ میں وہ اتنا عرصہ یکجا رہے تھے۔ کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے گہری محبت پیدا ہو گئی تھی۔ کسی شخص کے لئے جو ان کی سیرت کو سمجھ سکتا۔ اس مسلسل خوشی میں، اس فوجی زبان میں، نظروں کے یک ملاپ میں۔ جس کا مطلب "یوں کرو" اور دوسری طرف "میں سمجھ گیا" تھا۔ دوستی کے جذبات کا اس قدر شدید اظہار ہوتا۔ جو ایک بہت طویل گفتگو میں بھی ادا ہونا مشکل ہے۔

میدانِ جنگ میں ایک خطرناک مقام پر وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس تھے۔ کوئی سو گز کے فاصلہ پر، دشمن کی توپوں نے تباہی مچا رکھی تھی اور بار بار توپوں کے گولے سنسناتے ہوئے ان کے سروں پر سے گذر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بیتاب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جس وقت ان کی نگاہیں چار ہوئیں۔ انہوں نے یہ خیال کر کے کہ ایک مرتبہ ہم پھر بچ نکلے ہیں۔ اطمینان کا سانس لیا تھا۔

ایک مرتبہ ایک رات سے زیادہ عرصہ انہوں نے دور دراز کی ایک چوکی کی حفاظت میں اکٹھے گذار دیا تھا۔ ان کے پاؤں کیچڑ سے لت پت ہو رہے تھے۔ صبح ہوتی

تو انہیں ان کے کام سے سبکدوش کرنے کے لئے نئے محافظ بھیج دیئے گئے۔ یہ دیکھ کر ان دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ اور ان دونوں کی نگاہیں یہ کہتی ہوئی معلوم ہونے لگیں "اب ہم اپنے کیمپ کو واپس جا رہے ہیں۔ خوش ہو جاؤ۔ اب تم مزے سے آرام کر سکو گے۔"

گرمیوں میں بھی اکثر انہوں نے طویل سفر کئے تھے۔ دوران سفر میں وہ دونوں سڑک کے کنارے کے "سنگ ہائے میل" گنتے جاتے تھے اور جب ان کا سفر قریب الاختتام ہوتا تو اپنی پُرسکون نگاہیں ایک دوسرے سے تبدیل کرتے..... ایسی نگاہیں جو کہتی تھیں۔ "اب صرف دو میل باقی ہیں۔ اور ایک میل تو بس اب گذرا ہی چاہتا ہے۔ ابھی ہم منزل مقصود تک پہنچنے والے ہیں۔"

لشکرگاہ میں جب وہ اپنے دلوں کو بندوقوں اور توپوں کی اس گرج کیلئے تیار کر رہے ہوتے جو راتوں کو ان کی نیند حرام کر دیتی تھی۔ تو اکثر شامیں یوں گذر جاتیں کہ ایک جب اپنے خیمے میں آرام کرنے کے لئے جاتا تو دوسرا اس کو چلچلاتی سردی سے بچانے کیلئے اپنا لبادہ فرش پر بچھا دیتا اور پھر ذرا پرے کھڑا ہو کر کہتا۔ "آقا تسلیم"!

اور فوجی افسر کو یوں معلوم ہوتا جیسے اس کے اردلی کی آرزو کانپ رہی ہے اور اپنے فقرے کا آخری لفظ اس نے بڑی مشکل سے ادا کیا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اسی انداز اور لہجے میں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتا۔

بعض اوقات جب خط ایک کو ملتا اور ایک دوسرے کو دیتا۔ تو دوسرا اسے لینے کے لئے بےصبری کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا۔ اور دونوں کے چہرے ایک نامعلوم احساس سے چمک اٹھتے۔

"یہ خط تمہارے گھر سے آیا ہے۔ میں اس کا انداز تحریر پہچان گیا ہوں۔ یہ تمہاری

والدہ کا خط ہے"۔ ان میں سے ایک کہتا۔
دوسرا آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیتا۔" تم نے مجھے دو جہان کے خزانے بخش دیئے ہیں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ!"
آخر جنگ کا یہ زمانہ گزر گیا۔ اور وہ پھر خاموش اور سنجیدہ زندگی گزارنے لگے لیکن یہ اتفاق کبھی نہیں ہؤا تھا کہ افسر کے سامنے آتے ہوئے یا اس سے رخصت ہوتے وقت پُرغرور سپاہی اپنے ہاتھ کو ایک اندازِ شجاعت میں ماتھے تک نہ لیگیا ہو۔ اور پھر سر کو بلند کرکے اس نے سیدھے ہوکر ایک لمحہ کے لئے اپنے افسر کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالی ہوں جب وہ رخصت ہونے کے لئے پلٹتا۔ تو ہمیشہ فوجی قواعد آداب کی پابندی کرتا۔
انہیں باہم مل کر رہتے چار سال ہوگئے تھے۔ لیکن سپاہی کی مدّتِ ملازمت جسے ملازمت کے پہلے سال بعد ہی اردلی بنا دیا گیا تھا۔ اب ختم ہورہی تھی۔
ایک دن حکم موصول ہؤا کہ اس تمام فوجی جماعت کو اب سبکدوش کردیا جائے۔
اس دن آقا اور ملازم کی نگاہیں معمول سے زیادہ مرتبہ ایک دوسرے سے مخاطب ہوئی تھیں۔ مگر ان کے دل نگاہوں سے بھی زیادہ کوئی بات کہنا چاہتے تھے۔
"میرے لئے کوئی اور حکم ہے"
"ہاں ہے...... حکم آیا ہے کہ تم لوگوں کو اب سبکدوش کردیا جائے۔ دس دن کے اندر اندر تم لوگوں کو یہاں سے واپس بھیجدیا جائے گا۔"
اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی رہی۔ دونوں کی نگاہیں زمین پر جھکی ہوئی تھیں۔
"میں جاسکتا ہوں؟"

ہاں اگر چاہو تو جا سکتے ہو!"

معمول سے زائد یہ چند لفظ جذباتِ شوق کو جادۂ الفت پر بہت دور کہیں لے گئے۔

ان کے دل ایک دوسرے کیلئے بیقرار رہتے تھے۔ لیکن دونوں کی بیقراری کا درجہ یکساں نہ تھا۔ ایک اپنے دوست سے جدا ہو رہا تھا ـــــــ ایک ایسے دوست سے جو اس کے لئے بھائی سے بھی زیادہ مخلص تھا۔ اور جسے اس کے ساتھ ایک قسم کی فطری محبت تھی ـــــــ دوسرا بھی بلاشبہ اپنے دوست سے جدا ہو رہا تھا۔ لیکن کم از کم اتنی تسکین تو تھی کہ وہ اپنے والدین کے گھر واپس جا رہا تھا۔

اس کے لئے یہ خیال بہت مسرت بخش تھا کہ اتنی مدت کے بعد وہ اس قدر تکلیفیں اٹھانے کے بعد وہ گھر پہنچنے والا ہے۔ کیمپ میں اس نے بار بار بگل کی آواز سنی تھی جو روشنیاں گل کرنے کے لئے بجایا جاتا تھا۔ اس نے خیموں میں بتیوں کو ایک ایک کر کے گل ہوتے دیکھا تھا۔ اور جب اس "ناپائیدار شہر" پر جس کی دیواریں ٹاٹ کی بنی تھیں۔ رات کا گہرا اور سیاہ سکوت چھا جاتا تو ان غم انگیز لمحوں میں بار بار اسے اپنی ماں یاد آتی۔ وہ سوچتا کہ میری غریب ماں اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟۔

اس نے اکثر رات کے وقت اپنے ہم وطنوں کو ٹولیاں بنا کر وہ گیت گاتے سنا تھا جنہیں وہ اکثر چاندنی راتوں کو اپنے کھیتوں میں فصل کی حفاظت کرتے ہوئے بلند آواز سے گایا کرتا تھا۔ اس وقت اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے تمام عزیز و اقربا اس کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ پھر اس گیت کی دھیمی دھیمی نقرئی صدائیں دب کر رہ جاتیں اور اسے یوں معلوم ہوتا جیسے گیت اس کے دل میں اتر گئے ہیں۔ آہ کتنی مرتبہ

اس نے ان گیتوں کو اپنی ماں کی دعاؤں کے مترادف سمجھ کر انہیں قابل احترام اور مقدس سمجھا۔ خلاف توقع گھر پہنچنے کا خیال اس کے دل میں میٹھی میٹھی چٹکیاں لے رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں اور اس میں اس کا مکان دور ہی سے اسے نظر آ جائیگا۔ تو اس کے دل میں مسرت کی لہریں دوڑ جائیں گی۔ اپنے مکان کی مٹی کو وہ دور ہی سے پہچان لیگا۔ اس کے قدموں کی رفتار تیز تر ہو جائے گی۔ اور جب وہ گاؤں میں آ جائیگا تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگیگا۔ اس کی چھوٹی سی بہن اب کافی بڑی ہو گئی ہو گی۔ اور اس کا بھائی۔ اب بالکل جوان ہو گا۔ لوگ خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ اور پھر وہ ان سے پیچھا چھڑا کر اپنے گھر کی طرف تیزی سے لپک کر بڑھے گا۔ 'اماں' اماں' کہہ کر اپنی ضعیف ماں کو بلائے گا۔ اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے۔ پھر وہ اس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دے گی۔ اور وہ اس کی آغوش میں پہنچ کر اس خوشی کو پائے گا۔ جو دنیا کی تمام مسرتوں سے زیادہ مقدس ہے۔ یہ خیالات تھے جو اس وقت اس کے دل و دماغ کی تمام تلخیوں کو شیریں بنا رہے تھے۔

لیکن اس کا دل نہ مانتا تھا کہ قدرت اس کے آقا سے اسے اس قدر جلد جدا کر دیگی ایک سپاہی کے لئے یہ بات بالکل ناممکن ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس کمبل کو پرے پھینک دے۔ جسے کئی سال وہ اوڑھنے بچھونے اور تکئے کے طور پر استعمال کرتا رہا ہو۔ اور جس کی مدتوں اس نے حفاظت کی ہو۔ پھر اس کا دل اپنے آقا سے جدا ہو کر صدمے اور غم سے کیوں نہ چور چور ہو جاتا۔

نیک دل افسر اب مغموم رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی روزانہ گفتگو میں ایک لفظ کا اضافہ بھی نہ کیا تھا۔ سپاہی کا دل بھی بہت برا ہو رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں اب

معمول سے زیادہ مرتبہ ایک دوسرے پر اٹھتی تھیں۔ تم مغموم ہو؟ میں جانتا ہوں۔
کہ جدائی کی آنے والی گھڑیوں کا تصور تمہیں بے چین کر رہا ہے۔"

اردلی اب اپنے فرائض پہلے کی طرح پھرتی سے سرانجام نہ دیتا تھا۔ اپنے آقا کے پاس رہنے کی تمنا نے اسے سست اور کاہل بنا دیا تھا۔ وہ جدائی کی آنے والی گھڑیوں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ پہلے تو وہ خاص آہستگی سے اور پھر ایک مصنوعی سستی کے ساتھ کرسیوں اور میزوں کو صاف کرنے کیلئے بڑھتا لیکن اکثر اپنے خیالات میں کھو جاتا۔ اور نہایت بے دلی سے رومال کو میز کی سطح کے اوپر ہی اوپر ہلاتا رہتا۔ اس وقت اس کا افسر اپنے سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے ایک مجسمہ کی طرح اس آئینہ کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا رہتا۔ جس میں اس کے اردلی کا عکس نظر آ رہا ہوتا۔ وہ اس کی حرکات کا غور سے مشاہدہ کرتا اور اس کے چہرے کی کتاب سے اس کے مغموم جذبات کا مطالعہ کیا کرتا۔ لیکن جب کبھی ان کی نگاہیں آئینہ میں ایک دوسرے سے ملنے لگتیں۔ افسر بے پروائی کے انداز میں دوسری طرف دیکھنے لگتا۔

"آقا! میں جا سکتا ہوں۔" ملازم نے کہا۔

"جاؤ" افسر نے جواب دیا۔

اور سپاہی چلا گیا۔

وہ ابھی دو سیڑھیاں ہی اترا ہو گا۔ کہ کمرے سے افسر کی آواز سنائی دی۔

"اِدھر آؤ۔"

وہ پلٹا۔

کوئی اور حکم ہے؟ اس نے کہا۔

"نہیں، میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ۔۔۔ نہیں، نہیں، اچھا کل سہی جاؤ"
افسر نے جواب دیا۔

شاید افسر نے اسے صرف دوبارہ دیکھنے کے بلایا تھا۔ جب وہ اسے دیکھ چکا تو اس نے اپنی نظریں اس دروازے پہ گاڑ لیں۔ جس میں سے ابھی اس کا اردلی گزر گیا تھا رخصت کا دن آگیا تھا۔ افسر اپنی چھوٹی سی میز پر دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ کوئی نصف گھنٹہ کے بعد اب اردلی کو اسے آخری الوداع کہنے کیلئے آنا تھا۔ اس وقت افسر سگار پی رہا تھا۔ دھوئیں کے بادل چھت کی طرف اڑ رہے تھے۔ اور وہ مغموم و حیران نگاہوں سے ان بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دھوئیں کی وجہ سے بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ کہیں وہ رو تو نہیں رہا۔ اتنے بڑے بڑے آنسو اس کی آنکھوں سے کیوں گر رہے ہیں۔ وہ آنسوؤں کا باعث سگار کے دھوئیں کو قرار دے کر اپنے مخلصانہ جذبات کے متعلق اپنے نفس کو فریب دینا چاہتا تھا۔

نہ جانے وہ کتنا عرصہ خیالات میں کھویا رہا۔

"وہ روانہ ہونے کے لئے تیار ہو چکا ہے۔ پھر میرا دل کیوں مغموم نہ ہو۔ جب میں نے اس لڑکے کو اپنا اردلی مقرر کیا تھا۔ کیا اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ میں اسے ہمیشہ اپنے پاس نہ رکھ سکونگا۔ کیا میں نہیں جانتا تھا۔ کہ اس کی ملازمت کی مدت صرف پانچ سال ہے۔ آخر اس غریب کا بھی ایک گھر ہے۔ جہاں وہ پیدا ہوا۔ اور پھر جوان ہوا۔ اس کے رشتہ دار بھی ہیں۔ جنہیں اس نے انتہائی رنج و غم کی حالت

میں خیرباد کہا ہوگا۔ اور جن سے اب وہ بڑی خوشی سے ملیگا۔ کیا میری یہ توقع خود
غرضانہ نہیں کہ وہ ہمیشہ میرے پاس ایک اردلی حیثیت سے رہے۔ نہیں۔
نہیں۔ یہ میری انتہائی خود غرضی ہے...... اُف میں کیا سوچ رہا ہوں۔ واقعی میں
خود غرض ہوں۔ آخر اخلاق کیشی اور احسان کی وہ کونسی زنجیر ہے۔ جو اسے مجھ سے جُدا نہ
ہونے دے۔ وہ کس بات کیلئے میرا ممنون احسان ہے؟ میں اکثر اسے اپنی بدمزاجی اور غصے کا
تختۂ مشق بنا چکا ہوں۔ میں نے اس سے ہمیشہ تحکمانہ سلوک کیا ہے.... مگر یہ میری فطرت
ہے۔ اور میں اس کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ مجھے الفاظ نہیں مل رہے...... ملازمت کے
سلسلے میں ایسے الفاظ آخر اور ابھی کون کرسکتا ہے..... نہیں میں اب ایک ایسا چہرہ
دکھاؤنگا جس پہ پہلے سے کہیں زیادہ انسانیت نمایاں ہو رہی ہو.... آہ! اب وہ جا
رہا ہے۔ ہاں وہ اپنی پرانی زندگی اختیار کرلیگا۔ رفتہ رفتہ وہ فوجی عادات و آداب کو بھول
جائیگا۔ فوجی زندگی کے نقوش اس کے دل سے محو ہونے لگیں گے..... اپنی رجمنٹ
.... اپنے ساتھی.... اور اپنے افسر.... سب کی یاد اس کے دل سے مٹ جائے گی۔
اور وہ بے پروا ہو کر اپنی پرمسرت زندگی گذار سکیگا۔ آہ! کیا میں اسے بھلا سکونگا؟
.... اُف! مجھے کسی نئے چہرے سے آشنا ہونے کے لئے کس قدر مدت درکار ہوگی!"
صبح میں جب بیدار ہوا تو کیا کرونگا۔ مجھے یوں معلوم ہوگا۔ جیسے وہ اب بھی
اپنے کام میں تندہی سے مصروف ہے۔ لیکن چپ چاپ ہے اور اس خیال سے سانس
بھی رُک رُک کرلے رہا ہے۔ کہیں وقت سے پہلے نہ بیدار ہو جاؤں..... لیکن آہ! کتنی
مرتبہ میں اپنے بستر سے بیدار ہو کر بھی اسے نہ بلا سکونگا۔ سالہا سال کی رفاقت، اخلاص، محبت
اور.... پھر اسے یوں جدا ہوتے دیکھنا.... روز بروز۔ لیکن ہماری زندگی ہی کچھ ایسی ہے

اور ہمیں اسی پر قناعت کرنی چاہیئے ...... وہ کسقدر نیک دل تھا۔ اس کا دل ایک گوہر نایاب تھا۔ اگر کبھی سفر میں تھکن۔ گرمی اور گرد و غبار سے پژمردہ حال ہو کر میں ایک لمحے کے لئے بھی رکا۔ تو کبھی نے جھٹ میرے ہاتھوں میں پانی سے بھرا ہوا گلاس دیدیا اور ایک آواز میرے دل سے بھی اٹھتی "کیا تمہیں بھی پیاس لگ رہی ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مجھے کس قدر پیاس لگ رہی تھی۔ میں نڈھال ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی قطار کو چھوڑ کر پانی لینے کے لئے بھاگ کھڑا ہوا تھا اور نہ جانے کہاں اور کتنی دور چلا گیا تھا۔ پھر وہ جلد ہی واپس آگیا تھا۔ لیکن اس طرح کہ وہ ہانپ رہا تھا اور اس کا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ وہ ناتواں ہو کر میرے پیچھے کھڑا تھا۔ کیمپ میں اگر کبھی میں کسی درخت کے سائے میں سو جاتا تھا اور رفتہ رفتہ سورج ڈھل کر اپنی حدت آفریں شعاعیں میرے چہرے پر ڈالنے لگتا۔ تو فوراً ایک ہمدرد اور پرخلوص ہاتھ درخت کی شاخوں اور پتوں کو ترغیب دیکر مجھ پر چھاؤں کر دیتا یا چند سلطے کو ایکدوسرے کے ساتھ جوڑ کر ایک کوٹ بالکل پھیلا دیتا۔ اکثر سات آٹھ گھنٹے کے پیدل سفر کے بعد جب ہم اپنے خیمے کھولتے تھے۔ تو وہ یکایک غائب ہو جاتا تھا۔ میں جھلا کر اسے ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اور پکار پکار کر غصے سے آوازیں دیتا تھا۔ اور پھر غضب آلود لہجے میں کہتا تھا۔ دیکھو کمبخت کہاں غائب ہو گیا۔ اس کی یہ روش مجھے مطلق پسند نہیں۔ میں ابھی اسکی خوب مرمت کرونگا۔" میں اسی قسم کے فقرے کہتا جاتا تھا۔ کہ کچھ دیر کے بعد اسے پیال یا گھاس کی بہت بڑی گٹھڑی کے بوجھ تلے دبا ہوا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کیساتھ دائیں بائیں ان لوگوں سے لڑتا جو گھاس کی مٹھائیاں اس سے چھیننا چاہتے تھے۔ میری طرف بڑھتا ہوا نظر آجاتا۔ وہ خیمے کی رسیوں میں اپنے پاؤں الجھاتا دھوپ میں پھیلائی ہوئی بدبوں کو روندتا۔ لعنت

ملامت کا ایک طوفان اپنے سر پر لیتا ہوا میرے پاس آ پہنچا اور گٹھڑی کو میرے قدموں میں پھینک کر ایک لمبی سانس بھرتا پھر اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہتا۔

"میں نے آپ کو انتظار کی بہت زحمت دکھائی۔ لیکن کیا کرتا۔ مجھے گھاس کے لئے بڑی دور جانا پڑا۔"

پھر وہ گھاس زمین پر بچھا دیتا۔ اس کے اوپر اپنا تھیلا تکیئے کے طور پر رکھ دیتا اور پھر میری طرف پلٹ کر کہتا۔ "کیوں اب ٹھیک ہے نا؟"

میں دل میں کہتا "اے نیک دل ملازم! تجھ سے میری خفگی سراسر ناروا تھی۔"

... پھر میں اس سے کہتا "جاؤ... جاؤ اب آرام کرو۔ تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے۔"

"لیکن کیا گھاس کافی ہے؟ وہ کہتا۔" اگر کافی نہیں تو میں دوڑ کر اور لے آتا ہوں۔"

میں کہتا "نہیں! یہ بہت کافی ہے۔ تم جا کر آرام کرو۔ زیادہ وقت ضائع نہ کرو۔"

اور اگر کبھی رات کے سفر میں نیند سے مغلوب ہو کر میرے لڑکھڑاتے ہوئے قدم مجھے سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف لے جاتے۔ میں کسی خندق میں گرنے کو ہوتا۔ تو اس وقت ایک ہلکا سا بازو میرے ہاتھ کو آکر چھوتا اور مجھے آہستہ سے سڑک کے وسط کی طرف دھکیل دیتا۔ اور ایک دبی ہوئی خوف زدہ آواز مجھے سنائی دیتی۔ "آقا دیکھو آگے خندق ہے۔"

"آہ میں نے اس کے لئے کیا ہی کیا ہے۔ وہ کس بے لوث جاں نثاری کے ساتھ مجھ

سے پیش آتا تھا۔ اسے مجھ سے کس قدر محبت تھی۔ آخر مجھ میں وہ کون سی خوبی ہے
جس کی وجہ سے وہ مجھ پر اپنی پُر خلوص، توجہ اس قدر شدت سے مبذول کرتا تھا اور
میں کس قدر خود غرض ہوں مجھے ہمیشہ اپنا ہی خیال رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ضرورت
پیش آئے تو وہ مجھ پر اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کرے۔ آہ سیدھی سادھی اور بھولی
بھالی شکل والا، یہ غریب لڑکا جس کے ہاتھ پھاوڑا چلانے سے سخت ہو چکے ہیں۔ جس کا جسم
محنت اور مشقت نے مضبوط کر دیا ہے جس کی کوئی تربیت نہیں ہوئی۔ جو ایک جھونپڑے میں
پلا اور شہر کے تمدن و تہذیب سے نا آشنا رہا۔ ایک متمدن اور تہذیب یافتہ عورت سے
بھی زیادہ دھیما اور نرم مزاج بن گیا تھا۔

وہ میری نیند اُچاٹ ہو جانے کے خوف سے اپنی سانس روک لیتا تھا۔
میرے کپڑوں کو نہایت احتیاط سے ہاتھ لگاتا تھا کہ یہ خراب نہ ہو جائیں۔ میرے خط کو
اس احتیاط سے پکڑتا تھا کہ اس کے سر انگشت ہی لے چھوتے رہیں۔ تاکہ وہ آلودہ نہ ہو
جائے۔ وہ میرے التفاف آمیز تبسم اور مہربانی کے ایک لفظ ہی سے اس قدر مسرور ہوتا
گویا اسے اپنی تمام خدمت اور محنت کا صلہ مل گیا۔ وہ ایک ہی اشارے سے ایک
ہی لفظ میں میرا مطلب بھانپ لیتا تھا۔

یہ بات یقینی ہے کہ اس آدمی کا دل جو فوجی سپاہی نہیں ہوتا۔ فوجی کپڑے پہن
کر ان جذبات سے آشنا ہو جاتا ہے۔ جن سے پہلے وہ نا آشنا ہوتا۔ وہ سوائے
اس جذبے کے جو سپاہیوں کے دلوں کو ایام جنگ میں جوش سے بھرپور کر دیتا۔ اور کوئی جذبہ ہم
سے منسوب کر ہی نہیں سکتا۔ اس کو ہماری طبیعتوں سے کتنی نا واقفیت ہوتی ہے۔
سپاہی کا دل اوّل تو کبھی بوڑھا ہی نہیں ہوتا اگر ہوتا ہے تو پھر سے جوان ہو جاتا ہے

"میں اپنے سامنے کس کو دیکھ رہا ہوں؟ آقا! یہ تم ہو؟ تم کہاں آقا؟" وہ کہے گا۔

میں کہوں گا۔ "ہاں میں تم سے ملنے کے یہاں آیا ہوں۔ آؤ میرے پیارے سپاہی آؤ اور میرے گلے لگ جاؤ۔"

افسر انہی خیالات میں محو تھا کہ اسے سیڑھیوں پر کسی کے سست اور غیر ہموار قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے کوئی اپنے قدموں کو روک روک کر اوپر چڑھ رہا ہے۔

افسر اس آواز کی طرف توجہ دیئے بغیر اسے سننے لگا۔ اس کے دل میں ایک سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا کہ یہ وہی ہے۔۔۔ یقیناً یہ وہی اس کا اردلی اردلی کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے سلام کے لئے ہاتھ بڑھایا اور پھر ایک قدم آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نیچے جھک کر بڑے تعظیم پیش کیا۔ افسر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"الوداع" افسر نے اپنے ہونٹوں کو مشکل جنبش دیتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "الوداع" الوداع! تمہیں اپنا سفر مبارک ہو۔ اپنے گھر پہنچو۔۔۔ اور وہاں بھی ایسی ہی پاک اور مقدس زندگی بسر کرنا۔ جیسے تم نے یہاں بسر کی ہے۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور خدا حافظ!"

سپاہی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "آقا!"

"جاؤ جاؤ ورنہ تمہیں دیر ہو جائے گی۔ تمہیں پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔"

"آقا! میں جا رہا ہوں" اس نے کہا۔

افسر نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھا دیا۔ جسے سپاہی نے نہایت گرمجوشی سے اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

"تمہیں یہ سفر مبارک ہو..... مجھے بھول نہ جانا... اپنے افسر کو کبھی کبھی یاد کر لیا کرنا"
غریب اردلی نے جواب دینے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی زبان سے چند الفاظ کہنے چاہیے۔ لیکن الفاظ اس کی زبان پہ آ کر منجمد ہو گئے۔
افسر کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے افسر کی طرف دیکھا۔ جس کا منہ اب تک دوسری طرف تھا۔ اردلی ایک قدم اور آگے بڑھا۔ "آقا!" ایک ہچکی کے ساتھ اس کے منہ سے نکلا۔ اور وہ دوڑ کر چلا گیا۔ اس میں وہاں کھڑا رہنے کی تاب نہ تھی۔
افسر تنہا رہ گیا۔ اس نے مڑ کر تھوڑی دیر کے لئے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی کہنیاں میز پہ ٹیک کر اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔
اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے آ گئے۔ اور جلدی سے اس کے رخساروں پہ بہہ نکلے۔ اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر پھیر لئے۔ تاکہ کوئی اس کے آنسوؤں کو نہ دیکھ لے۔
اس نے اپنے سگار کی طرف نگاہ ڈالی۔ جو اب بجھ چکا تھا۔ اب وہ سچ مچ رونے لگا۔ اس نے اپنا سر بازوؤں پہ گرا لیا۔ اور اپنے آپ کو غم واندوہ کے سمندر میں غرق کر دیا۔

(ایڈمنڈ امیسس)

گمشدہ ستارے

مَیں اپنی نظم کا پانچواں شعر لکھ رہا تھا کہ میرے ملازم نے مجھے آواز دی۔
"حضور باہر دو فرشتے کھڑے ہیں۔ اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"
مَیں نے جواب دیا۔ "کیا انہوں نے تمہیں ملاقاتی کارڈ دیئے ہیں؟"
ملازم کہنے لگا۔ "جی ہاں، یہ ہیں ان کے ملاقاتی کارڈ!"
پڑھا تو ایک کارڈ پر لکھا تھا "ہیلائل" اور دوسرے پہ "یافائیل"
مَیں نے دل میں کہا۔ اچھا تو دو فرشتے مجھ سے ملنے آئے ہیں۔"
میں نے ملازم سے کہا۔ "ان سے کہو اندر آ جائیں!"
میں خوش تھا کہ ایسے معزز مہمان مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ ان کے خوبصورت جسم اُن بڑے بڑے شہپروں میں چھپ رہے تھے جن میں سے ہر ایک سات سات پروں سے مل کر بنا تھا۔ اور جن کی سطح پہ قوس قزح کے ساتوں رنگ صبح کی دھندلی روشنی کی لطافت کے ساتھ مل کر جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ ان کے جسموں پر کہیں

کہیں نظر پڑتی تھی۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ برف سے بنے ہوئے ہیں۔ اور
کی سفیدی میں گلابی رنگ کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آتی تھی۔
میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان فرشتوں کو بیٹھنے کیلئے کہا۔ اور نہایت ملائمت
سے ان سے پوچھا۔ "کہیے کیسے تشریف آوری ہوئی؟"
ہیلائل کہنے لگا۔ "ابھی قصہ مختصر یہ ہے۔ کہ آج سے سولہ[۱۶] سال پہلے موسم بہار کی
ایک نہایت ہی خوبصورت رات کو ہم آسمان کے سبز قالین پر بلیئر کھیل رہے تھے..."
"معاف فرمایئے!" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آسمان نیلا ہے۔"
ہیلائل نے جواب دیا کہ "ہاں بعض عمیق مقامات پر وہ نیلا ہی ہے اور دوسرے
مقامات پر مثلاً جو اطراف ایران کی طرف ہیں۔ اس کا رنگ سبز ہے۔ جو آنکھوں کو بہت
ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔"
میں جواب میں خاموش رہا۔
ہیلائل نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کہا "ہاں تو گیندوں کی بجائے ہم
ان ستاروں سے کھیلتے رہے۔ جو آسمان پر سب سے زیادہ حسین تھے۔"
میں نے پوچھا۔ "اچھا تو چھڑیاں کس چیز کی تھیں؟"
ہیلائل کہنے لگا۔ "چھڑیوں کی بجائے ہم نے کھیل میں دمدار ستاروں کی دمیں
استعمال کیں۔ ہمارا کھیل بہت ہی دلچسپ تھا۔ میں بازی جیتنے ہی والا تھا کہ میں نے
اس زور سے ضرب لگائی کہ دو ستارے کناروں کو طے کر کے پرے چلے گئے..... ہاں
افق کے کناروں کو...... یہ ایک لرزہ انگیز حادثہ تھا۔ تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ آسمان
پر سے دو ستاروں کا گم ہو جانا کتنا اہم واقعہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہمیں آسمان کے حاکم

کی طرف سے ایک فرمان موصول ہوا کہ جب تک ہم ان ستاروں کو ڈھونڈ کر اپنی جگہ پر نہ لگا دیں۔ ہمیں جنت کی خوشیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہ ہوگی۔

خدا را ذرا سوچیئے! اس سولہ سال کے عرصے میں ہم نے زمین کے اس حصے کا کونہ کونہ چھان مارا ہے۔ جدھر یہ تارے گرے تھے لیکن بدقسمتی سے اب تک ہماری کوششیں ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔

تھک ہار کر ہم اپنے لئے ہمیشہ کی جلاوطنی کی سزا قبول کرنے ہی والے تھے کہ ہم نے ایک دوشیزہ کی بے مثل آنکھوں کی تعریف سنی۔ اور سنا ہے کہ وہ لڑکی تمہاری منسوبہ ہے اگر ان باتوں پر یقین کر لیا جائے جو ان آنکھوں کے متعلق مشہور ہو رہی ہیں تو ان میں سے ہر بات یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کی آنکھیں انسان کی کالی آنکھوں کی سی نہیں بلکہ اس کی آنکھیں وہ آسمانی نور ہیں جن کی تلاش میں ہم مدتوں سے بھٹک رہے تھے کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں یہ ستارے واپس کر دے گی۔"

فرشتے کی یہ بات سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس خیال نے کہ میری محبوبۂ جان نواز کی آنکھیں چھن جانے والی ہیں۔ مجھے دیوانہ کر دیا۔ لیکن آہ یہ صرف میری ہی طاقت میں نہ تھا۔ کہ فرشتوں کو ان کی کھوئی ہوئی آسمانی دولت واپس لا کر دوں۔ اور کسی سے یہ ممکن نہ تھا۔

میں نے اپنی منسوبہ کو بلا بھیجا اور چند الفاظ میں ساری داستان اس سے کہہ دی وہ میری باتیں سن کر بالکل متعجب نہ ہوئی۔ نہ اسے کوئی پریشانی لاحق ہوئی اس نے ایک لمحے کیلئے کچھ سوچا۔ پھر ایک ادا کے ساتھ اپنی پلکوں کو اوپر اٹھا کر کہنے لگی:۔

"خوبصورت فرشتو! غور سے میری آنکھوں میں جھانکو اور اپنے ستاروں کو ان میں

بیوی کا انتقام

تاریخ ہمارے سامنے دوسرے واقعات کیساتھ ساتھ نفس کی قربانی کی بہترین مثالیں بھی پیش کرتی ہے۔ اور بتاتی ہے کہ دُنیا میں ایسی ایسی ہستیاں بھی ہو گذری ہیں جنہوں نے محبت کی خاطر نہ صرف اپنی خوشی، آرام اور آزادی بلکہ زندگی تک قربان کر دی ہے۔ اور ایسی داستانیں بھی سناتی ہے۔ جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات جذبۂ انتقام انسان کو اس قدر مغلوب الغضب بنا دیتا ہے۔ کہ اس کا دل رحم و محبت کے جذبات سے بالکل عاری ہو جاتا ہے۔

جذبۂ انتقام کی مثالوں میں کوئی مثال اس قدر دردناک اور رُوح فرسانہ ہو گی۔ جتنی اس پولش ماں کی کہانی ہے جس نے اپنے خاوند کے خون کا بدلہ لینے کیلئے اپنے تمام لطیف جذبات کو کچل ڈالا۔

جس واقعہ پر اس کہانی کی بنیاد ہے۔ وہ حال ہی میں جبکہ ہالینڈ میں ہٹلر کی فوجیں تباہی مچا رہی تھیں پیش آیا۔ پولینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے باشندوں

نے ہٹلر اور اس کی فوجوں کے مظالم کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ جرمن مغلوب ملک کو کس طرح تباہ و برباد کرتے ہیں۔ کس طرح گھروں کو لوٹا جاتا ہے مکانوں کو نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔ اور مفتوح ملک کے باشندوں کا خون پانی کی طرح بہا دینے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔

چنانچہ اس گاؤں کے سب باشندوں نے یکجا مجتمع ہو کر کافی بحث مباحثے کے بعد یہ طے کیا کہ اپنا مال و متاع دشمن کے حوالے کر دینے سے یہی بہتر ہے کہ ہم گاؤں کو اپنے ہاتھوں تباہ و برباد کر دیں تاکہ دشمن ہمارے مال و متاع اور خوراک وغیرہ سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

اگرچہ گاؤں کے باشندوں کے پاس بہت کم وقت تھا۔ تاہم پورے پورے استقلال کے ساتھ مصروفِ کار ہو گئے۔ اور آن کی آن میں انہوں نے گاؤں کو کھنڈر بنا دیا۔ جن مکانوں سے لوگ ابھی ابھی باہر نکلے تھے۔ ان کی چھتیں دھوئیں کے غولے اور آگ کے شعلے اگلتی ہوئی یکے بعد دیگرے زمین پر گر رہی تھیں۔

ابھی کل کی بات تھی کہ انگوروں کی ہری بھری بیلیں جنہوں نے اس گاؤں کے حسن میں ایک دلآویز اضافہ کر رکھا تھا۔ اور اپنی پوری پوری بہار دکھا رہی تھیں۔ آج انہیں جڑ سے اکھاڑ کر پرے پھینک دیا گیا تھا۔ اور پہاڑی پر کے انجیر کے پُرثمر درختوں کو ان کی ٹہنیاں کاٹ کر ٹُنڈ مُنڈ بنا دیا گیا تھا۔

آج اس گاؤں میں بچوں کی پیاری پیاری باتیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ بلکہ آج تو پرندے بھی اپنے شیریں گیت سنانے سے ڈرتے تھے۔ جلتی ہوئی لکڑیوں کی چٹاخوں کی سی آواز یا اس چھوٹی سی ندی کے شور کے سوا جو لوٹتے ہوئے دلوں اور آتش زدہ مکانوں کے قریب سے بے لاپروائی کے ساتھ بہتی جا رہی تھی اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا

ہر طرف موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

لیکن ایک جھونپڑی میں جس کا نصف حصّہ سڑک سے گذرنے والے مسافروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتا تھا۔ ابھی زندگی کے کچھ آثار نظر آ رہے تھے یہ ایک کسان کی جھونپڑی تھی۔ جو اس وقت خطرناک طور پر علیل ہونے کے باعث دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے لئے گوشۂ عافیت تلاش نہ کر سکا تھا۔ اس نے اپنی ازدواجی کے پہلے تین سال کا پُر مسرت زمانہ اسی جھونپڑی میں گزارا تھا۔ لیکن اب وہ صرف چند ساعتوں کا مہمان نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں وہ کسی مکان کی ضرورت سے بے نیاز ہو جانے والا تھا۔ اگر مخلصانہ تیمارداری اس کے مرض کا واحد علاج ہوتی۔ تو وہ کبھی کا اچھا ہو گیا ہوتا۔ کیونکہ اس کی فرمانبردار بیوی اس کے ہر لفظ، ہر اشارے اور ہر نگاہ کا حکم ماننے کے لئے ہر وقت اس کے سرہانے کھڑی رہتی تھی۔

مریض نیم جان اپنی بیوی سے کہنے لگا۔" تھریسا! — میری وفادار شریک زندگی! جب تم مجھے موت کی آغوش سے نہیں چھین سکتیں۔ تو پھر تمہیں یہاں رہنے پر اصرار کیوں ہے؟ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ تم ہٹلر کے وحشی سپاہیوں کے ناپاک ہاتھوں سے محفوظ ہو گئی ہو تو بڑے اطمینان سے میں جان دے سکوں گا۔ جاؤ اپنے لئے اور اس پیارے بچے کے لئے کوئی جائے پناہ تلاش کر لو۔"

تھریسا کہنے لگی۔" میرے آقا! یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ ممکن ہے سپاہی سڑک سے گزر جائیں اور انہیں ہماری جھونپڑی نظر ہی نہ آئے۔ کیونکہ اس کا نصف حصّہ سڑک پر سے گزرنے والوں کی نظر سے اوجھل رہتا ہے۔ بہت ممکن ہے۔ کہ ہم ان کے وحشیانہ پنجے سے بچ جائیں۔"

اس کے بعد مریض کو کھانسی اُٹھی جس سے گفت و شنید کا سلسلہ مسدود ہو گیا ویران گاؤں پر شام کی اداس تاریکی چھا رہی تھی کہ یکایک مارچ کرتے ہوئے بھاری قدموں کی آوازنے سکوت کو توڑا۔

جرمن سپاہی خوراک اور پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ طویل مسافتیں طے کرتے کرتے ان کے پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ جب انہیں سامنے ہی ایک گاؤں دکھائی دیا۔ تو مارے خوشی کے اچھلنے لگے۔ لیکن جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا۔ کہ اس گاؤں پر کیا بیتی ہے۔ گاؤں کی ویران حالی دیکھ کر ان وحشیوں کے سر پر حیوانیت کا بھوت سوار ہو گیا۔ اور یہی حیوانیت کچھ دیر بعد خونخوار درندگی میں تبدیل ہو گئی جس خوراک کیلئے وہ مارے مارے پھر رہے تھے۔ وہ ان کے پاؤں کے نیچے خاک میں پامال ہو رہی تھی۔ اور وہ انگور جو ان کی پیاس بجھانے کیلئے کافی تھے۔ سڑک کے گڑھوں میں مسلے پڑے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے قسم کھائی۔ کہ اگر گاؤں کا ایک متنفس بھی انہیں مل گیا۔ تو وہ اپنا سارا غصہ اسی پر نکالیں گے۔

چنانچہ وہ گاؤں کے گوشے گوشے میں کسی متنفس کی تلاش میں پھرنے لگے۔ صرف ایک جھونپڑی میں انہیں زندگی کے کچھ آثار نظر آئے۔

فوجی افسر نے دروازے کو کھٹکھٹائے بغیر ایک دھکا دیکر کھول دیا۔ بڑھیا نے سامنے فوجیوں کو کھڑے دیکھ کر اپنے خاوند کی چارپائی کے آگے کھڑی ہو گئی۔ تاکہ اسے ان کی خونخوار آنکھوں سے بچا لے۔ مگر ایک سپاہی نے اپنی پوری بہیمانہ قوت کیساتھ اسے دھکا دیکر پرے گرا دیا۔ اور آگے بڑھ کر اس کے دیکھتے دیکھتے بندوق کی سنگین سے اس کے خاوند کو قتل کر ڈالا۔

الفاظ میں درد و کرب کا نقشہ کھینچنے سے قاصر تھا۔ جو اسوقت اس عورت کے نالہ و شیون سے عیاں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بے جان محبوب کو اپنے آغوش میں لئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ لیکن فوجیوں پر اس کی آہ و زاری کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ انسانیت اور رحم کے جذبات مارتیں ہوئیں۔ ان کے دلوں سے مفقود ہو چکے تھے۔ انہوں نے تھریسا کو گھسیٹ کر الگ کر دیا اور اسے حکم دیا کہ کھانے پینے کی کچھ چیزیں فوراً تیار کرے۔

تھریسا کو ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی ڈراونا خواب دیکھ رہی ہے وہ انتہائی رنج و الم میں کچھ اس طرح ادھر اُدھر پھر رہی تھی کہ اس کا غمزدہ وجود خود فوجیوں کو بھی وحشت زدہ کر رہا تھا۔ گھر میں کھانے پینے کی جتنی چیزیں موجود تھیں۔ اس نے لاکر ان وحشی درندوں کے سامنے رکھدیں اور اپنے بچے کو جسے اس حادثے کے دوران میں وہ نظر انداز کر گئی تھی۔ تھپک تھپک کر سلانے لگی۔

تھریسا فوجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنے میں بہت خاموشی سے مصروف کار تھی۔ فوجی بہت غور سے اسے گھور رہے تھے۔ اور اس کا اطمینان و سکون ان کے دلوں پر چھُریاں چلا رہا تھا۔ اس نے کھانا لاکر ان کے سامنے رکھ دیا۔ لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھے رہے کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ایک ہی نوالہ اٹھا کر منہ میں ڈالے۔

آخر تھریسا کہنے لگی "تم کھانے کی طرف یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھ رہے ہو۔ جو تم نے مانگا میں نے دیدیا۔ جتنا تمہارا جی چاہے کھاؤ۔ اور پھر اپنی راہ لو میرا فاؤنڈ ابدی نیند سو چکا ہے۔ تم نے اسے اس وقت قتل کیا جب کہ وہ تمہاری بزدلی اور حیوانیت کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی نہ تھا۔ جاؤ میں تنہائی میں اس کی موت پر آنسو بہانا چاہتی ہوں...... آہ!"

وہ پھر ایک تنفر آفرین ہنسی ہنس کر بولی "شاید تم اس لئے کھانا کھانے سے ہچکچا رہے ہو کہ تمہیں شراب میں زہر کی ملاوٹ کا اندیشہ ہے۔ لاؤ اس شراب کا پہلا گلاس میں پیتی ہوں۔ تاکہ تمہارا یہ شبہ بھی رفع ہو جائے۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر شراب کا گلاس اُٹھالیا۔ اور اسے پینے ہی والی تھی کہ فوجی افسر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہنے لگا "ماں کی محبت جان کی محبت سے زیادہ زبردست ہوتی ہے۔ اس لئے یہ پیالہ اپنی بجائے اپنے بچے کے منہ سے لگاؤ۔"

ایک زہر خند کے ساتھ اس نے بلا تامل اپنے بچے کو جگایا۔ اور پیالہ اس کے لبوں سے لگا کر دو چار گھونٹ پلا دیئے۔ جب وہ ان کے امتحان میں پوری اُتری تو انہوں نے بےخوف ہو کر کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ جوں ہی ان کی بھوک دبی اور پیاس بجھی۔ انہوں نے اپنے بیہودہ مذاق اور فضول قسموں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔

یکا یک بچے کی چیخ سنائی دی اور معاً یہ حقیقت ان پر روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ موت کا قاصد نہایت بیتابی سے ان کا انتظار کر رہا ہے۔

جس جس کے ہاتھ میں جو جو کچھ تھا۔ اس نے پرے پھینک دیا۔ اور سب کے سب تھرلیسا پر پل پڑے۔ اور غضب ناک آواز سے پوچھنے لگے "یہ تو نے کیا کیا؟ یہ تو نے کیا کیا۔؟"

"میں نے کیا کیا؟" تھرلیسا چلا کر بولی "میں نے تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا۔ جو تم نے میرے خاوند کے ساتھ کیا ہے۔ جسے میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ اور میں نے اپنے پیارے بچے کو اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے شوہر کا اِنتقام لینے کے لئے قربان کر دیا ہے۔ زندگی اب میرے لئے کوئی اہمیت

نہیں رکھتی۔ اس لئے تم مجھ سے جیسا سلوک چاہتے ہو کرو۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے جان سے مار ڈالو گے۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے۔ کہ تم اب کسی اور خاوند کی بیوی کا دل ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔ تھوڑی ہی دیر بعد تم سب کو ابدی نیند سو جانا ہے۔"

غضب ناک فوجیوں نے جوشِ وحشت و دیوانگی میں وہ آخری ظلم بھی کر ڈالا جس کے بعد اس دنیا میں ان کے ظلم و ستم کا خاتمہ ہو جانے والا تھا۔

بہت جلد جھونپڑی پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اور ہٹلر نے اپنی فوج کے سپاہیوں کا ایک دستہ کھو دیا۔ جسے ایک عورت کے ناتواں ہاتھوں نے ابدی نیند سلا دیا تھا۔

اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز بغل میں دبائے اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ساشا سمرناف ڈاکٹر کوشل کاف کے دفتر میں داخل ہوا۔

ڈاکٹر بڑی گرمجوشی کے ساتھ بولا:۔

"اچھا تو ننھے میاں ساشا! آج تم کیسے ہو؟ کوئی اچھی خبر لائے ہونا؟"

ڈاکٹر کی بات سن کر ساشا کچھ گھبرا سا گیا۔ اپنی آنکھیں جھپکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھے اور ہکلا کر بولا۔

"امی جان نے آپ کو سلام کہا ہے۔ ...... اور وہ کہتی تھیں۔ کہ میری ترف سے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنا ...... میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں آپ نے میری جان بچائی ہے۔ ...... اور ہم دونوں نہیں جانتے کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کریں۔"

ڈاکٹر انتہائی مسرت کے ساتھ قطع کلام کرتے ہوئے بولا "چھوڑو، اگر میرے

ننھے دوست! لیکن چھوڑو اس ذکر کو۔ ایسی باتیں کیوں کرتے ہو میں نے جو کچھ کیا ہے میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔"

لڑکا کہنے لگا۔ میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ہم غریب آدمی ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ نے میرے علاج کے لئے جو تکلیف اٹھائی ہے اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔...... ہم بہت سٹ پٹا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں جو اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میں اور میری امی دونوں آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمارا ایک تحفہ قبول کر لیں۔ جسے ہم شکریہ کے طور پر آپکی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تحفہ بڑا قیمتی اور نایاب ہے۔ کانسی کا بنا ہوا ہے۔ اور عہدِ عتیق کی ایک حیرت انگیز یادگار ہے۔

بچے کی بات سنکر ڈاکٹر کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوگئے۔ اور وہ کہنے لگا۔ "پیارے دوست! مجھے قطعاً اسکی ضرورت نہیں ہے مجھے ہرگز ہرگز یہ تحفہ نہیں" ساتھا ہکلا ہو کر بولا۔ نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب! میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اسے ضرور قبول کر لیں۔"

اس کے بعد لڑکے نے بنڈل کھولنا شروع کیا۔ اور اس سلسلہ میں اس نے اپنی التجاؤں کا سلسلہ جاری رکھا۔

" اگر آپ نے اسے قبول نہ کیا۔ تو میں اور میری امی دونوں آپ سے ناراض ہو جائیں گے۔...... یہ آرٹ کا ایک نادر نمونہ ہے۔...... عہد عتیق کی کانسی کا بنا ہوا ہے ملے میرے ابا چھوڑ گئے ہیں۔ ہم نے اسے اب تک ان کی ایک نہایت ہی عزیز یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھا ہے۔...... ابا جان قدیم زمانے کی کانسی

کی مورتیاں خریدا کرتے تھے۔ اور پرانے زمانے کی مورتیوں کے شائقین کے پاس انہیں فروخت کر دیتے تھے۔ اور اب ان کا کام ہم نے سنبھال رکھا ہے ــــ میں نے اور امی نے!"

ساشا نے پیکٹ کھولا اور بڑے جوش کے ساتھ کالسی کے شمعدان کو میز پر رکھ دیا یہ عہد عتیق کا ایک پست قد شمعدان تھا۔ آرٹ کا صحیح نمونہ تھا۔ اس کی "چوکی" پر ایک "جوڑا" کھڑا تھا۔ دو عورتیں اماں حوا کے لباس میں ملبوس کچھ ایسے انداز میں کھڑی تھیں جس کے بیان کرنے کی نہ مجھ میں جرأت ہے نہ ہمت۔ یہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر نہائیت نازو ادا کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا تھا کہ اگر یہ شمع کو سہارا دینے کا کام انجام دینے پر مجبور نہ ہوتیں تو "چوکی" سے نیچے جھک کر ایسی حرکت کر بیٹھتیں جس کے تصوّر سے بھی حیا آتی ہے۔

جب ڈاکٹر نے تحفے کو دیکھا تو اس نے آہستہ سے اپنا سر کھجلایا۔ گلا صاف کیا اور اپنی ناک سے "سی سی" کی آواز نکالنے لگا۔

اور پھر بڑبڑا کر کہنے لگا۔ "ہاں یقیناً یہ ایک نہائیت ہی خوبصورت چیز ہے ...لیکن... میں یہ کس طرح کہوں ــ ... یہ ٹھیک نہیں ... میرا مطلب یہ ہے کہ ... یہ کچھ غیر رسمی سا ہے ...... یہ "ادبی" بالکل نہیں تم جانتے ہو؟ ..... جانے میری بلا ......!

لڑکا کہنے لگا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

ڈاکٹر بولا۔ "ایسی بدہیئت چیز تو شیطان کے تصوّر میں بھی نہیں آسکتی۔ اگر میں نے ان خیالی مجسموں کو اپنی میز پر رکھ لیا تو میرا مکان ناپاک ہو جائے گا۔"

"آہ ڈاکٹر صاحب! آرٹ کے متعلق آپ کے نظریئے کتنے عجیب و غریب ہیں۔ ساشا نے غصّے سے چلّا کر کہا۔" یہ حقیقت میں ایک شاہکار ہے۔ ذرا اسے دیکھئے تو سہی، اس کا حسن کچھ ایسا مسرت انگیز ہے کہ اس کا تصوّر کرتے ہی رُوح پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ اور گلے سے مسرت کی ایک چیخ نکل جاتی ہے۔ جب ایسی خوشنما چیز پر نظر پڑتی ہے۔ تو ہم تمام ارضی چیزوں کو بھول جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ذرا اسے دیکھئے تو سہی۔ اس میں کتنی زندگی ہے۔ کتنا جوش ہے۔ اور اس کے چہرے کے تاثرات کتنے خوشنما ہیں۔"

ڈاکٹر نے قطع کلام کرتے ہوئے جواب دیا۔" پیارے بچے! میں ان سب باتوں کو سمجھتا ہوں۔ لیکن میری تو شادی ہو چکی ہے۔ اس کمرے میں بچے تمام دن دوڑتے پھرتے ہیں۔ اور عورتیں بھی مسلسل طور پر آتی جاتی رہتی ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ساشا نے کہا۔" بشرطیکہ آپ اسے عوام کی نظروں سے دیکھ رہے ہوں۔ اس صورت میں یہ آپ کو ایک اور ہی رنگ میں نظر آئیگا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ کی ہستی اُن لوگوں سے بالاتر ہے۔ آپ کے انکار سے میں جو اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اور میری اماں، دونوں آپ سے بہت ناراض ہو جائیں گے۔ ... آپ نے میری جان بچائی ۔۔۔ اور اس کے صلے میں ہم آپ کو اپنی عزیز ترین شے پیش کر رہے ہیں۔ ... ہمیں افسوس ہے کہ اس شمع دان کے مقابلے میں رکھنے کے لئے اسی قسم کا دوسرا شمع دان ہمارے پاس نہیں ہے۔

"شکریہ میرے دوست! بہت بہت شکریہ! ... اپنی اماں سے میرا سلام کہنا۔ ..... لیکن خدا کیلئے تم ذرا خود ہی غور کرو ..... بچے تمام دن کمرے میں دوڑتے پھرتے ہیں اور عورتیں بھی مسلسل طور پر آتی جاتی ہیں۔ اچھا بھائی رکھ جاؤ یہاں۔ طاق میں

کون تمہارے مقابلے پر پورا اتر سکتا ہے۔

ساشا خوشی سے چلا کر کہنے لگا۔ "بس بس اب کوئی اور لفظ نہ لیجئے بس گلدان کے مقابل میں اسے رکھ لیجئے خدا کی قسم! لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس شمعدان کا ساتھی موجود نہیں۔ لیکن کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ اچھا ڈاکٹر صاحب! خدا حافظ!"

ساشا کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر بڑی دیر تک شمعدان پر نظریں جمائے اپنے سر کو کھجاتا رہا۔

ڈاکٹر دل ہی دل میں کہتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت خوبصورت ہے۔ ٹھیک بالکل ٹھیک .... اسے پھینک دینا بھی ظلم ہوگا .... لیکن مجھے اسے اپنے پاس رکھنے کی بھی تو جرات نہیں ...... اچھا تو اب دنیا میں کون ایسا شخص ہے جسے میں یہ بطور تحفہ پیش کر دوں۔"

بڑی دیر تک عزیز میں ڈوبے رہنے کے بعد اسے اپنا ایک دوست یوخوف یاد آگیا جس نے اس کی بہت سی قانونی خدمات انجام دی تھیں اور وہ اس کے احسان کا زیر بار تھا۔

یوخوف کا نام یاد آتے ہی ڈاکٹر خوش ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"یوخوف بڑا عزیز دوست ہے۔ میں اس کی خدمات کے صلے میں اسے روپیہ پیش نہیں کر سکتا روپے کی بجائے میں اسے یہ تحفہ پیش کر دونگا..... بس، بس۔ اس تحفے کے لئے یوخوف بالکل موزوں ہے...... اور وہ تو ہے بھی گھر میں تن تنہا۔ اس کے بیوی بچے بھی نہیں ہیں۔ وہ تو ایک مسرور پرندہ ہے۔ مسرور پرندہ! "

یہ خیال آتے ہی اس نے کپڑے پہنے اور شمع دان لیکر توخوف کے گھر کی طرف چل دیا۔

"السلام علیکم بھائی توخوف! میں آج تمہاری تکلیف کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں جو تم نے میری خاطر اٹھائی ہے۔۔۔۔۔۔ تم روپیہ تو لوگے نہیں بس تمہاری خدمات کے صلے میں ایک تحفہ دوں گا۔ تحفہ کیا ہے ایک شاہکار ہے، ایک شاہکار!"

جب اس عجیب شے پر وکیل کی نظر پڑی تو اس کے حُسن سے متاثر ہو کر وہ اچھل پڑا۔

وہ بڑے زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا اور کہنے لگا۔ "آرٹ کا کیسا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ دیوتاؤ! دیوتاؤ!۔۔۔ اوہ! ان فن کاروں کے دماغوں میں بھی کیسے کیسے خیالات جاگتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ تو جادو کی تصویر ہے جادو کی۔۔۔۔۔۔ ارے یہ کہاں سے پایا ہے؟"

لیکن یکایک اس کی مسرت پر مُردنی چھا گئی۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا اور وہ کمرے کے دروازے پر نظر دیدہ لگا ہیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"لیکن بھائی! میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ اسے بس فوراً ہی واپس لے جاؤ۔۔۔۔۔۔"

ڈاکٹر گھبرا کر کہنے لگا۔ "کیوں"

"اس لئے کہ۔۔۔۔۔۔ اس لئے کہ میری ماں اکثر میرے پاس آتی رہتی ہے۔ یہاں میرے موکلوں کی آمد و رفت بھی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ میں اپنے نوکروں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاؤں گا۔"

"بس بس اب کوئی اور لفظ نہ کہنا۔" ڈاکٹر نے جھلا کر کہا۔ "بس تمہیں یہ تحفہ قبول کرنا ہوگا۔ بڑے ناشکر گزار ہو گے۔ اگر اسے قبول نہ کرو گے۔۔۔۔۔ ایسے زبردست شاہکار کو! اس میں ایک زندگی ہے! زندگی! اور اس کے چہرے کے تاثرات تو دیکھو۔ بس بولتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔۔۔۔ اگر تم نے اسے قبول نہ کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گا"

"ہاں! اگر اسے کھجور کے پتوں سے ڈھانپ دیا گیا ہوتا یا۔۔۔۔۔"

اب ڈاکٹر نے سنی ان سنی ایک کر دی اور پہلے سے زیادہ شور مچایا۔ اور اس تحفے کو لوخوف کے حوالے کر کے اس کے گھر سے دوڑ کر باہر نکل گیا۔ اور شکر کرنے لگا کہ اسے اس سے نجات ملی۔

جب ڈاکٹر چلا گیا تو وکیل نے شمعدان کا غور سے معائنہ کیا۔ اور جس طرح کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر سوچ رہا تھا۔ کہ اسے کیا کروں۔ وہ بھی سوچنے لگا۔ کہ اس تحفے کو میں کہاں ٹھکانے لگاؤں۔

اس نے دل میں سوچا۔ "کتنی خوبصورت چیز ہے۔ اسے پھینک دینا ظلم ہوگا لیکن اسے پاس رکھنا بھی ذلت ہے۔ اسے کسی کو تحفے کے طور پر دے دینا چاہئے۔۔۔۔ اوہو! خوب یاد آیا۔۔۔۔۔ آج شام مجھے ساشکن کے پاس جانا ہے۔ وہ ایسی چیزوں کا بڑا دلدادہ ہے۔ اور اس کے علاوہ آج رات تھیٹر میں اس کا پارٹ بھی ادا کرنے والا ہے"

یہ خیال آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اسی سہ پہر کو یہ شمعدان لیکر ساشکن کے گھر پہنچا گہری شام تک ساشکن کے ڈریسنگ روم میں لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ ہر کوئی دوڑ دوڑ کر اسے دیکھنے آتا تھا۔ اور اس عرصے میں کمرہ زندہ دلانہ قہقہوں کی آوازوں سے جو گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے مشابہ تھے۔ گونجتا رہا۔ جب کوئی ایکٹرس ڈریسنگ روم

کے دروازے کے پاس کھڑی ہو کہ کہتی کہ میں اندر آسکتی ہوں؟ ساشکن نہایت تندہی کے ساتھ جواب دیتا۔ نہیں نہیں پیاری ہرگز اندر نہ آنا۔ میں لباس پہن رہا ہوں۔"

اپنا کھیل ختم کرنے کے بعد ایکٹر نے اپنے کندھوں کو جنبش دی۔ اپنے ہاتھ سے ایک عجیب اشارہ سا کیا اور بولا۔

" لیکن یہ شمعدان میرے کس کام آئے گا۔ میں ایک پرائیویٹ کرے میں رہتا ہوں۔ اکثر میرے ہاں ایکٹرسیں آتی جاتی ہیں۔ اور یہ کوئی فوٹو تو ہے نہیں کہ اسے اٹھایا اور دراز میں رکھ دیا۔

بالوں کی ٹوپی بنانے والا اس سے بولا" لیکن تم اسے فروخت کیوں نہیں کر دیتے۔ ایک بوڑھی عورت ہے۔ جو زمانہ قدیم کے کانسی کے برتن خریدا کرتی ہے اس کا نام سمرنوفا ہے .... بہتر ہے کہ تم دوڑ کر اس کے پاس ہو آؤ۔ تمہیں اس کے گھر کا آسانی سے پتہ مل جائے گا۔ ہر کوئی اسے جانتا ہے۔

ایکٹر نے اپنے دوست کے مشورے پر عمل کیا۔ دو دن بعد کوشل کاف اپنے سر کو ہاتھ کا سہارا دیئے دفتر میں بیٹھا کچھ گولیوں کا نسخہ تجویز کر رہا تھا۔ کہ یکایک دروازہ کھلا اور ساشا دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے لبوں پر مسرت کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ اور اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا..... اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی...... ایک اخبار میں لپٹی ہوئی۔

لڑکے کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اسی حالت میں وہ چلا کر بولا۔

ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب! میں آج بہت خوش ہوں۔ قسمت کے کھیل نیارے

ہیں..... دیکھئے تو مجھے اس شمعدان کا دوسرا ساتھی مل گیا ہے۔ اب آپ اسے اس کے مقابلے پر رکھ سکتے ہیں۔ امی بھی بڑی خوش ہیں۔ میں اپنی امی جان کا اکلوتا بیٹا ہوں ..... آپ نے میری جان بچائی ہے۔

ساشا نے خوشی اور تشکر کے جذبات سے کانپتے ہوئے شمعدان ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھ دیا....

ڈاکٹر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا..... اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی....!!

(انطون چیخوف)

دُلہن کی چوڑی

یہ گہرے نیلے رنگ کی ایک چوڑی تھی۔ جس کی شکل سانپ سے بہت زیادہ ملتی جلتی تھی۔ لیکن یہ بالکل بے حقیقت اور ناکارہ سی معلوم ہوتی تھی۔

جب میں نے اوّل اوّل اسے اپنی منسوبہ کو پہنے ہوئے دیکھا۔ تو اپنے دل میں کہا: "اس نے کتنی گھٹیا اور ادنٰے درجے کی چوڑی پہن رکھی ہے۔ بخیر میں اسے ایک اور اچھی سی قیمتی چوڑی دے دوں گا۔"

چنانچہ چند ہی دن بعد میں نے اسے "سنگِ بحر" کی ایک نہایت خوبصورت چوڑی خرید دی۔ اس کی شکل بھی کنڈلی مارے ہوئے سانپ سے مشابہ تھی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ حوّا کی بیٹیوں کے لئے سانپ کا نشان بہت موزوں ہے۔

وہ اس چوڑی کو لیکر بہت خوش ہوئی۔ جب وہ اپنی نگاہیں نیچی کئے ہوئے چوڑی کی ڈبیا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تو اس کی نیلگوں آنکھوں میں مسرت نور بن کر چمکتی نظر آتی تھی۔ اور اس کے گالوں پر ایک ایسی سُرخی نمودار ہو اٹھی تھی جیسی میری لائی ہوئی

چوڑی ہی نظر آتی تھی۔

اس نے ڈبیا میرے ہاتھ سے چھین لی اور میری گردن میں باہیں حمائل کر دیں۔ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے چوم لیا۔ اب مجھے پوری پوری امید تھی۔ کہ کل وہ اپنی چوڑی کو اُتار کر پھینکے گی اور میری پہن لے گی۔

مگر دوسرے دن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ بدستور اپنی کانچ کی چوڑی پہنے ہوئے ہے۔ اس وقت میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس کے متعلق کچھ کہوں۔ لیکن خود بخود میرے دل میں اس چوڑی کے متعلق طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ اور میں نے سوچنا شروع کیا کہ ہو نہ ہو اس چوڑی میں ضرور کوئی رازِ پنہاں ہے دو تین دن تک تو میں نے ضبط سے کام لیا۔ لیکن آخر مجھ سے دامنِ صبر چھوٹ گیا اور میں نے اس سے کہا۔

"میں نے تمہیں ایک چوڑی دی تھی۔ تم نے اسے پہنا کیوں نہیں؟"

وہ میری طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

میں نے کہا۔ "تمہیں اس نکمی اور گھٹیا چیز سے اس قدر عشق کیوں ہے.....؟"

اس نے جواب میں اس چوڑی پر صرف ایک عمیق نگاہ ڈالی۔ اور کچھ دیر خاموش رہی۔ ازاں بعد اس نے نہایت سختی سے مجھ پر ایک خشمگین نگاہ ڈالی۔ اس وقت اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھ کر میں کانپ گیا۔ میں اس رنگ کی توضیح نہیں کر سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ نیلی نہ تھیں۔

میں نے اس سے ذرا رُکتے رُکتے کہا۔ کیا میری لائی ہوئی چوڑی تمہیں پسند نہیں۔

کیا تم اُسے پہننے کے قابل نہیں سمجھتیں ؟"

وہ کہنے لگی "میں کل اُسے ضرور پہنوں گی۔ میں ہمیشہ اپنی چوڑی کو پہننا چاہتی تھی۔ لیکن چونکہ یہ تمہیں پسند نہیں ....." یہاں آکر وہ رُک گئی۔

اب اس نے ایک بار پھر کانچ کی چوڑی پہ ایک دل نشین نگاہ ڈالی۔ اور کہنے لگی "بہت بہتر کل سے میں تمہاری لائی ہوئی چوڑی ہی پہنوں گی۔"

اس وقت اس کی طرزِ گفتگو بہت غم آلود تھی۔ وہ کچھ متفکر سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے اس کا موجودہ فیصلہ میری محبت کی چوکھٹ پہ ایک قربانی ہے۔ اور میں نے اس کے گھنگھریلے بال جو اس کی سنجیدہ پیشانی پہ بکھرے تھے چوم لئے۔

دوسرے دن بھی اس نے وہ چوڑی نہ پہنی۔ آج میں نے بلا تامل اس سے پوچھا "پھر آج تم نے میری چوڑی کیوں نہیں پہنی ؟"

"وہ کہنے لگی "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں بھول گئی ...... مگر نہیں اس وقت اسے تلاش کرنے میں بہت وقت ضائع ہوگا۔ کل تو میں اسے ضرور ہی پہن لونگی۔"

میں نے اس کی بات مان لی۔ اور کچھ نہ کہا۔ لیکن دوسرے دن بھی اُس نے چوڑی نہ پہنی۔ جتنا میں اس کانچ کی چوڑی کی طرف دیکھتا۔ میرے جذبات اتنے ہی زیادہ بھڑک اُٹھتے تھے۔ میرا غصہ اتنا ہی بڑھتا جاتا تھا۔ لیکن یہ غصہ محبت کا غصہ تھا۔ جو بات بات پر بھڑک سکتا ہے۔ چنانچہ مجھے اپنا دلی اضطراب چھپانے کے لئے یا اس معاملے کے متعلق خاموش رہنے کے لئے بہت کاوش اور ضبط سے کام لینا پڑا۔

کئی روز گزر گئے۔ مگر میری منوبہ کے دل میں میری چوڑی پہننے کا خیال تک نہ آیا

اور اپنی طرف سے میں نے بھی اب ارادہ کر لیا۔ کہ اس چوڑی کے متعلق اب کچھ نہ کہوں گا۔ اس دن کے بعد ایک محدود عرصہ کے لئے ہمارے دل صاف ہو گئے اور کدورت کا تمام گرد و غبار دُھل گیا۔

ایک شام کو مجھے ایک سفر درپیش آیا۔ مجھے ایک ہفتہ کے لئے باہر رہنا تھا۔ رخصت کے وقت جب میں اسے اپنے آغوش میں بھینچ بھینچ کر پیار کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ جب میں واپس آؤں۔ تو تمہیں اسی چوڑی پہنے ہوئے دیکھوں۔"

وہ کہنے لگی۔ "بہت اچھا!"

مَیں نے کہا۔ "وعدہ کرتی ہو؟" اُس نے جواب دیا۔ "ہاں"

"تمہیں میری محبت کی قسم!" مَیں نے کہا۔

"ہاں مجھے تمہاری محبت کی قسم!" اس نے جواب دیا۔

یہ قسم اس نے کچھ ایسے انداز سے کھائی کہ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر اس نے میری دی ہوئی چوڑی نہ پہنی تو مَیں اس سے قطع تعلق کر لونگا۔

جس روز مجھے واپس پہنچنا تھا۔ مَیں نے والستہ تار کے ذریعے اسے اپنی آمد کی خبر کر دی اور دوسرے دن میں خود پہنچ گیا۔ اس نے لپٹنے دونوں مرمریں بازو مجھے اپنی آغوش میں لیٹنے کے لئے میری طرف پھیلا دیئے۔ آہ! اس وقت اس نے میری چوڑی پہن تو رکھی تھی۔ مگر پرانی بھی اس کے دوسرے بازو میں موجود تھی۔

میں اس سے کہہ ہی کیا سکتا تھا۔ وُہ میری طرف کچھ ایسے انداز سے دیکھنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہے۔ کہ "دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ آؤ۔ اور مجھے جرم نوبناشکری نہ کرو۔"

میں نے کئی بار اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ بھینچ کر چوما۔
"ہاں۔لیکن یہ فیصلہ تو نہیں ہُوا تھا" میں نے جلدی سے اس کے دوپٹے سے لیتے ہوئے کہا۔
"تمہارا کیا مطلب ہے؟ اس نے کہا۔
میں نے جواب دیا۔" میں نے تمہیں یہ چوڑی پہننے اور اپنی چوڑی اُتار دینے کے لئے کہا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ دونوں پہن لینا۔"
نہیں نہیں، بخدا تم نے مجھے اپنی چوڑی پہننے کو کہا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ دوسری چوڑی نہ پہننا۔" اس نے کہا۔
میں نے جواب دیا۔" ہاں۔ ہاں، یہ ٹھیک ہوگا۔ لیکن فرض کرو۔ اگر یہی بات میں تم سے اب کہوں تو"؟
اگر اب ......اگر اب کہو گے ....." اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ساری بات تم سے کہہ دوں، یہ کہہ کر وہ کان کے قریب آئی اور آہستہ سے بولی۔
"میں تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہونے دونگی۔
زمین میرے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ میں چونک کر پرے ہٹ گیا۔ جیسے مجھے کانچ کے اسی سانپ نے ڈس لیا ہے۔ جو وہ اپنی کلائی میں پہنے ہوئے تھی۔
میں نے کہا۔" اگر میں تمہیں ایک ایسی چوڑی پہننے سے روکوں۔ جو مجھے ناپسند ہے۔ تو یہ کوئی ایسی بُری بات تو نہیں۔"
وہ بولی۔" ادھر آؤ۔ چھوڑو اس قصے کو۔ اگر یہ تمہیں اتنی ہی بُری معلوم ہوتی ہے تو میں اس کا پہننا ترک کر دونگی۔ اور کل سے صرف تمہاری چوڑی پہنونگی۔"

اب مجھ سے بہت بھاری غلطی سرزد ہوگئی۔ اس کی قربانی کے جواب میں اپنے جذبات تشکر کا اظہار کرتے کرتے میں اس سے یہ پوچھ بیٹھا کہ "تمہیں یہ چوڑی کس نے دی تھی؟"

میرے اس سوال سے اس کے گالوں پر نہ سرخی نمودار ہوئی اور نہ زردی البتہ اس کی زبان میں کچھ لکنت سی آگئی۔ اور وہ بولی: "میں نہیں جانتی.... نہ مجھے اچھی طرح یاد ہے...... ہاں مدت ہوئی۔ والد نے بطور تحفہ دی تھی۔"

اب مجھ سے ایک اور غلطی سرزد ہوئی۔ جو پہلی غلطی سے زیادہ خوفناک تھی۔ ایک دن میں اس کے باپ سے ملنے گیا۔ اور اس سے کہہ بیٹھا کہ میری (میری منسوبہ کا نام) کی نقلی سی نیلے رنگ کی چوڑی بہت ہی خوبصورت ہے۔ وہی جو آپ نے دی تھی۔"

اس کے باپ نے اپنی عینک کو آنکھوں کے قریب کھسکا کر کچھ اس طرح مجھ پر نگاہ ڈالی۔ جیسے اس نے اس چوڑی کا ذکر اس سے پہلے کبھی نہ سنا ہو۔ اور کہنے لگا۔ "میں نے تو اسے کوئی چوڑی نہیں دی۔"

اس کے باپ کے اس فقرے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میرے دل میں رشک و رقابت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے میری رگ رگ میں چوڑی کے سانپ کا زہر سرایت کر گیا ہے۔

اب میں اپنی سوچی ہوئی تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا "یا تو میری اس چوڑی کو پہننا ترک کر دے گی یا میں اس سے تعلقات منقطع کر لونگا۔ میں مر جاؤنگا۔ خودکشی کر لونگا۔ ہر بات مجھے قبول ہوگی۔ لیکن میری کو یہ چوڑی نہ پہننے دونگا۔"

مجھ پر ناقابل برداشت جذبہ غیظ و غضب نے قابو پا لیا۔

اب میں نے تیسری خوفناک غلطی کا ارتکاب کیا یعنی میں نے میری سے کہہ دیا۔ تمہیں اس چوڑی کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ مجھے اس کے متعلق تمام باتوں کا علم ہو گیا ہے اب مجھے یہ تمہارے ہاتھوں میں کبھی نظر نہیں آنی چاہیئے۔ میں نے آج تمہیں آگاہ کر دیا ہے تمہاری ضد کا اگر کوئی بُرا نتیجہ نکلا تو میں اس کا ذمہ دار نہ ہونگا۔"

میں منتظر تھا کہ وُہ مجھ سے پُوچھے کہ مجھے اس چوڑی کے متعلق کونسی باتوں کا علم ہو گیا ہے۔ مگر وہ بالکل خاموش رہی۔ اس نے صرف حیرت زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں نے جو اس وقت موسم بہار کے آسمان کی نیلاہٹ اپنے اندر مستور کئے ہوئے تھیں۔ میرے غُصّے کو فرو کر دیا۔

اس طرح گیارہ دن گزر گئے۔ میرے لئے ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر دن کا ہر لمحہ میرے لئے عذاب الیم سے کم نہ تھا۔ گیارہ دن تک وہ مجھے وعدوں میں ٹالتی رہی کہ آج اس چوڑی کو اتار دونگی کل اتار دونگی۔ وہ آج کچھ کہتی کل کچھ۔ طرح طرح کے حیلے بہانے تراش لیتی۔ کبھی خفا ہو جاتی۔ کبھی خاموش رہتی۔ اور کبھی میری التجاؤں کو ہنسی میں ٹال دیتی۔ مگر وُہ کمبخت چوڑی اس کے مرمریں کلائی سے کسی طرح بھی جُدا نہ ہوئی۔ اور جب وہ اپنے دونوں گورے گورے بازوؤں کو آپس میں ملاتی اور دونوں سانپ آپس میں مل جاتے۔ تو مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا۔ جیسے یہ دونوں کسی جادو سے زندہ ہو گئے ہیں اور ان کی آپس کی خونخوار رقابت اور زہر فشانی آنِ واحد میں جلا کر راکھ کر دیگی۔ میں دل میں کہتا۔ ہاں ان میں سے ایک ضرور کبھی نہ کبھی صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہیگا۔

ایک دن میں نے تنگ آکر اس سے کہا۔" سُنو کل سے تمہیں صرف ایک چوڑی پہننی ہو گی۔ اگر تم نے اس چوڑی کو اتار نہ دیا۔ تو میں اس بارے میں تمہیں اپنے

آخری فیصلے سے مطلع کر دونگا۔"

اب کی مرتبہ اس نے یہ میری بات بڑی توجہ سے سُنی اور اندر جا کر ایک چوڑی پہن آئی۔ مگر وہ میری نہ تھی۔ مجھے طیش آ گیا۔ اور غصے میں میرے منہ میں جھاگ بھر آئی۔ اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ اس وقت مَیں نے اس سے کیا کہا۔

وُہ میری غصے سے بھری ہوئی باتوں کو چپ چاپ سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہو گیا۔ تو وہ مجبور ہو کر نہایت عزم اور استقلال سے جیسے کوئی مرد گفتگو کرے بولی۔

"سُنو، تم مجھ سے ایک ایسا مطالبہ کر رہے ہو جسے مَیں کبھی پورا نہیں کر سکتی۔ مَیں اس چوڑی کو کبھی اپنے آپ سے جدا نہ کرونگی۔ مَیں اسے مرتے دم تک پہنے رہونگی۔ اس کے متعلق زیادہ باتیں نہ پوچھو۔ کیونکہ میں اس کے متعلق تمہیں کوئی بات بتانے کیلئے تیار نہیں۔ تمہیں صرف اتنا بتا دینا چاہتی ہوں۔ کہ اگر تم اب بھی اپنی ضد پر اڑے رہے تو مَیں تمہیں تمہاری نسبت کی انگوٹھی واپس کر دونگی۔ گو اس سے مجھے صدمہ ہوگا۔ کیونکہ مجھے تم سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق ہے۔ میں تمہاری شریک حیات بننا چاہتی ہوں۔ مگر مَیں اکیلے رہنے کو ترجیح دونگی۔ اور چوڑی کو نہ چھوڑوں گی۔ مَیں نے اس چوڑی کے متعلق آخری فیصلہ سنا دیا ہے۔ اب تم جو چاہو کر سکتے ہو۔"

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے اس سے بے انتہا محبت تھی۔ ورنہ مَیں اتنی باتیں کبھی نہ سنتا۔ اور اس کا راز معلوم کرنے کے لئے کبھی اس قدر مضطرب نہ ہوتا۔ آخر مَیں نے قسم کھائی کہ اب مَیں اس کا راز معلوم کرنے کی کوشش نہ کرونگا۔ لیکن میں بھلا اپنی قسم پر کیونکر قائم رہ سکتا تھا۔ مجھے میری سے بہت محبت تھی۔

شادی کے دن اور اس کے بعد بھی کافی مدت تک چوڑی کے متعلق ہماری کوئی

گفتگو نہ ہوئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس معاملے میں اب میں خاموشی اختیار کروں گا
اس کے علاوہ اب میں کافی حد تک اس منحوس چوڑی کو دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا لیکن
حقیقت یہ ہے کہ میری بے اندازہ محبت میرے جوشِ رقابت کے مقابلے پر پوری نہ
اُتری۔ میرے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں اب بھی امید باقی تھی۔ وہ امید جو ایک
سچے عاشق کے دل میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

مجھے یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی دن اپنی محبت کی قوت سے میں میری کے ہاتھ سے
یہ چوڑی اُترا لونگا۔ پھر وہ اس چوڑی کی پُر اسرار کہانی خود ہی مجھے سُنا دے گی
اور اسے پھینک کر میری چوڑی پہن لے گی۔

اس میں شک نہیں کہ میری کی بعض باتیں مجھ پر ایک سحر انگیز اثر ڈالتی تھیں
جب وہ کبھی ڈر جاتی تو سہم کر چوڑی والا بازو اُٹھا لیتی۔ اور یوں معلوم ہونے لگتا۔
جیسے وہ اپنے آپ کو کسی خطرے سے بچا رہی ہے۔ ایسے موقع پر میں اسے عجیب و
غریب حرکتوں سے دق کیا کرتا۔ اور وہ رحم طلب نگاہوں سے یوں میری طرف
دیکھنے لگتی۔ جیسے کہہ رہی ہو" کیا تم اپنے وعدوں کو بھول گئے؟ تمہیں اپنی قسم یاد نہیں؟"

ہم نے ابھی اپنی پُر مسرت زندگی کا ایک سال بھی نہیں گزارا تھا۔ کہ مجھے یوں محسوس
ہونے لگا۔ جیسے میرا صبر اور میری محبت مجھے ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل رہے ہیں۔
میری امیدیں یاس سے بدلنے لگیں اور میری کے پُر اسرار دل تک میرے دل و دماغ
کی رسائی نہ ہو سکی۔ اگر میں چوڑی کے متعلق اشاروں میں باتیں کرتا تو اپنا چہرہ وہ اس
طرح بنا لیتی۔ جیسے وہ کچھ سمجھی ہی نہیں اور جب میں کوئی بات واضح طور پر کہہ دیتا۔ تو
بھی وہ مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیتی۔

عموماً وہ میری بات سُنکر بلند آواز سے قہقہہ لگا دیتی۔ پھر میری بات کو ہنسی مذاق میں اُڑا دیتی۔ اور میں انگاروں پر لوٹنے لگتا۔ اب میری حالت پھر ویسی ہی ہو گئی جیسے شادی سے پیشتر تھی۔

جب میری بیوی کو میری حالت کا علم ہوا تو وہ نہایت ملتجیانہ انداز میں مجھ سے بولی کہ "مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں تمہاری بہت ممنون ہونگی۔ مجھے زیادہ پریشان نہ کیا کرو۔ تم نے اب پھر وہی باتیں شروع کر دی ہیں جن سے میں تمہیں روکا کرتی تھی۔ حالانکہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کہ تم مجھے پریشان نہ کیا کرو گے۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ تمہاری ان حرکتوں کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میرے دل سے تمہاری محبت کا نقش مٹ جائے گا۔ میرے دل میں تمہارے لئے نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اور پھر یہ سوال ہی پیدا نہ ہوگا کہ میں کونسی چوڑی پہنوں اور کونسی نہ پہنوں"

میں اس کی تقریر سے مرعوب ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا "خدا کی قسم! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس چوڑی کا پورا اسرار افسانہ سنا دو۔ مجھے بھی اپنے راز میں شریک کر لو۔ اور مجھے بتا دو کہ یہ تمہیں کس نے دی تھی۔ تمہاری شکل کی ایک بہن نے اس چوڑی کے متعلق جو کچھ کہا ہے۔ کیا وہ سچ مچ صحیح ہے۔"

وہ گرج کر بولی "خاموش رہو۔ خدارا خاموش رہو۔ تم میری محبت کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے ہو۔ اگر تم نے ایک لفظ بھی کہا۔ تو مجھے تم سے بے انتہا نفرت ہو جائے گی۔ اور میں تم سے اپنے تعلقات کا دائمی طور پر خاتمہ کر دونگی۔"

اس کی بات سُنکر میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے زور سے میرے سر پر لاٹھی دے ماری ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی

اور اس نے کمرے کے تمام دروازے بند کر لئے۔

اب چوتھی غلطی یہ ہوئی۔ کہ بدقسمتی سے اٹھ کر اپنے ایک عزیز دوست سے ملنے چلا گیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "کیوں کیا بات ہے۔ آج تم بہت پریشان نظر آرہے ہو؟" میری انتہائی بدقسمتی تھی کہ میں نے اسے شروع سے لیکر آخیر تک تمام واقعہ سُنا دیا۔

میرے دوست نے اس موقع پر وہی کچھ کہا۔ جو عام لوگ کہا کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "تم ایک کمزور سیرت احمق ہو۔ تمہیں مرد بننا چاہیئے۔ اور اپنی بیوی کو اپنا مطیع بنانے کے لئے پوری پوری کوشش صرف کر دینی چاہیئے۔ جاؤ ہو ایک غیر متزلزل عزم کے ساتھ اسے اپنی بات ماننے پر مجبور کرو۔ چند دن میں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

اس نصیحت کو سُن کر جیسا میں گھر واپس آیا تو وہ ایک پلنگ پر سو رہی تھی۔ شمع کی جگمگ جگمگ کرتی روشنی شیشوں میں سے چھن چھن کر اِدھر اُدھر منعکس ہو رہی تھی۔ اور سرخ روشنی کا عکس خون کے دھبوں کی مانند نظر آرہا تھا۔ ایسا ہی ایک دھبہ میری کے چہرے پر بھی پڑ رہا تھا۔ اس کا گورا گورا بے حس و حرکت بازو اس کی چادر سے باہر پھیلا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر مُردنی چھا گئی ہے۔ میری نظر اس منحوس چوڑی پر پڑی۔ جو شمع کی سرخ روشنی میں چمک رہی تھی۔ میری بڑے آرام سے محوِ خواب تھی۔ اس کا چہرہ غم اور پریشانی سے یکسر خالی تھا۔ یہانتک کہ یہ نابکار چوڑی بھی اس کے آرام میں خلل انداز نہیں ہو رہی تھی میں نے دل میں سوچا۔ کاش میں معلوم کر سکوں کہ اس وقت وہ کیا خواب

دیکھ رہی ہے۔ اس منظر نے مجھے بے خود کر دیا۔ مجھے تکلیف ہونے لگی۔ میرے غصے کا پارہ چڑھ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک غبار سا چھا گیا۔ اور میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

یکایک میرے دل میں ایک خوفناک جرم کے ارتکاب کا خیال آیا۔ یہ خیال بجلی کی سی سرعت سے مجھے سوجھا اور پھر میں کسی طرح اسے نظر انداز نہ کر سکا۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں نے ایک مرتبہ اس حرکت کا ارتکاب کیا تو میری عمر بھر کی پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

میں دبے پاؤں آہستہ آہستہ میری کے بستر کے قریب پہنچا۔ اور اس پر جھک گیا۔ میں نے ایک ہاتھ میں سانپ کی دُم اور دوسرے ہاتھ میں اس کے منہ کو لے کر اپنے ہاتھوں کو صرف ایک ہلکی سی جنبش دی۔ ۔ ۔ ۔ آخر ارتکاب جرم کے لئے کس قدر تھوڑا وقت درکار ہوتا ہے۔ چوڑی ٹوٹ گئی۔

کانچ کے ننھے ننھے ٹکڑے بستر پر بکھرے ہوئے تھے۔ ۔ ۔ میری نے اپنی نیلگوں آنکھیں کھول دیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ تمام باتیں ایک لمحہ میں گذر گئیں۔ وہ ننگے پاؤں ہاتھ میں چوڑی کے ٹکڑے لئے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ مگر اس کی آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ کیا میں انہیں کبھی بھلا سکونگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اب تک ہر وقت اسی طرح میرے سامنے موجود رہتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان آنکھوں کی پتلیاں اپنے گوشوں سے نہایت خوفناک انداز کے ساتھ مجھے گھورتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ان کی نیلاہٹ سیاہی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور ان میں سے شعلوں کی لپٹیں

نکلتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ان کی سفیدی ایک وحشت خیز سفید شعلے کی طرح مشتعل ہو رہی تھی۔

جس انداز میں اس نے مجھے مخاطب کیا۔ اس انداز کا نقشہ الفاظ میں کھینچنا میرے لئے ناممکن ہے۔

وہ گرج کر بولی۔

" تم نے اسے توڑ ڈالا ہے! ..... تم نے اسے توڑ ڈالا ہے!! ..... بہت اچھا اب ختم ہوگئی ہماری محبت! تم نے محبت کو ذبح کر دیا ہے ..... تم نے زنجیر محبت کا ایک ایک حلقہ جدا کر دیا ہے ..... تم نفس پرست، کم عقل، جاسوس اور دغاباز ہو ..... ابھی تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ کہ مجھے یہ چوڑی کس نے دی تھی؟ ..... اس کے متعلق کوئی رومانی افسانہ نہیں ہے ..... نہ کوئی راز ہے مجھے صرف اس کے پہننے کا وہم تھا۔ تم نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور مجھے کئی سال عذاب میں مبتلا رکھا ..... آہ! مجھے تم سے نفرت ہے تمہاری اس حرکت کی وجہ سے اب مجھے تم سے گھن آنے لگی ہے۔ جاؤ۔ اور میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔ ..... خدا کرے۔ اب میں کبھی تمہاری صورت نہ دیکھوں۔"

حقیقت میں اس رات کے بعد میں اپنی بیوی سے جدا ہو گیا۔ وہ سال کی ناقابل برداشت زندگی کے بعد

اس نے قسطنطنیہ جا کر پھر شادی کر لی۔ میرے ایک دوست نے جو چند روز ہی ہوئے وہاں سے واپس آیا ہے مجھے بتایا کہ وہ ایک خاص چوڑی پہنے رکھتی ہے جو سنگ بحر کی بنی ہوئی ہے۔

(گریگوری زینو یو)

فیروزہ

(۱)

عبداللہ ایک بہت بڑا زمیندار تھا۔ اپنے چھوٹے سے گاؤں کا بادشاہ وہی تھا۔ سلیم اس کا بیٹا اور فیروزہ اس کی بھتیجی تھی۔ عبداللہ کو ان دونوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا۔ کہ سلیم کی شادی فیروزہ سے کروں گا۔ فیروزہ کو اپنے چچا کی اس آرزو کا علم تھا۔ گویا ایک طرح سے وہ سلیم سے منسوب ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ شاید اسی وجہ سے اسے سلیم سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ اور فیروزہ ہر وقت سلیم کے سامنے رہتی تھی۔ اس لئے وہ فیروزہ کو قدرتاً ایک معمولی شکل کی لڑکی سمجھتا تھا۔ اور اس سے شادی کرنے پر رضامند نہ تھا۔

ایک دن عبداللہ نے اپنے بیٹے کو پیار سے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ میرے بیٹا اگرچہ میں نے بڑی عمر میں شادی کی تھی۔ لیکن میری آرزو ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے پوتے کو کھیلتا ہوا دیکھوں۔ میں نے تمہاری منسوبہ منتخب کر لی ہے۔ اس کی صورت شکل بھی بہت اچھی ہے۔ گھر کا کام کاج بھی بڑے سلیقے سے کرتی ہے۔ تم سمجھ گئے ہوگے

کہ میرا اشارہ فیروزہ کی طرف ہے۔ وہ میرے مرحوم بھائی کی نور نظر ہے۔ ایک دفعہ میری اور اس کی لڑائی ہو گئی۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کر کسی دور دراز ملک میں چلا گیا وہیں اس نے وفات پائی۔ صرف اس خیال سے میں نے اس کی لڑکی فیروزہ کو بڑی محبت سے پالا ہے۔ اب ماشاءاللہ تم بھی سیانے ہو چکے ہو اور وہ بھی جوان ہے تم اس سے جلد شادی کر لو۔ میں کئی سالوں سے اسی خیال میں غرق رہا ہوں۔ اور میری دلی آرزو ہے کہ تم دونوں کو دولہا دلہن بنتے ہوئے دیکھوں۔

سلیم نے باپ کی طویل تقریر سنکر جواب میں صرف اتنا کہا "میں فیروزہ سے شادی نہیں کر سکتا۔ بلکہ میں یوں کہوں گا۔ کہ چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے فیروزہ سے میں شادی نہیں کروں گا"

بوڑھے عبداللہ کو بیٹے کے اس روکھے جواب پر بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا۔

"ہیں! کیا تم فیروزہ سے شادی نہیں کرو گے؟ بڑے گستاخ ہو۔ مجھے ایسا جواب دینے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ ہمارے وقتوں میں باپ کے الفاظ قانون کی طرح اٹل سمجھے جاتے تھے۔ اور میں بھی اپنے الفاظ کو قانون کی طرح اٹل منوا کر چھوڑونگا۔ سلیم! دیکھو! میں تمہیں اس بات پر غور کرنے کے لئے ایک مہینہ کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر تم میری بات مان گئے، تو خیر ورنہ خدا کی قسم! میرے گھر میں تمہارا ٹھکانا نہیں اپنا سامان باندھ کر یہاں سے چلے جانا۔ اور مجھے عمر اپنی منحوس شکل نہ دکھانا۔"

سلیم مارے غصے کے پاگل ہو گیا۔ اور اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگا۔ وہ فیروزہ کی شکل پر جتنا زیادہ غور کرتا۔ اتنی ہی زیادہ اسے بُری معلوم ہوتی۔ اب وہ فیروزہ سے نہایت تلخ کلامی اور درشتی سے پیش آنے لگا۔ لیکن جواب میں فیروزہ

اس سے نہایت نرمی اور ملائمت سے پیش آتی۔ ایک مہینہ ختم ہونے سے پہلے سلیم باپ کا گھر چھوڑ گیا اور ایک کسان کے پاس کھیتوں میں ہل چلانے کے کام پر نوکر ہو گیا۔ اور اس نے ایک مزدور کی لڑکی عائشہ کے دل پر اپنی محبت کا سکہ بٹھا کر اس سے شادی کر لی

جب برات کے نقاروں کی آواز عبداللہ کے گھر میں سنائی دی۔ تو اس نے اپنی بھتیجی فیروزہ کو پاس بلا کر کہا۔ "میری بیٹی! مجھے تم سے بڑی محبت ہے۔ لیکن اگر تم نے اس شخص سے کوئی بات کی۔ جسے لوگ میرا بیٹا کہتے ہیں۔ یا تم نے اس عورت سے گفتگو کی۔ جسے لوگ اس کی دلہن کہیں گے۔ تو یاد رکھنا۔ اس دن سے میرے گھر کے دروازے تمہارے لئے بھی بند ہو جائیں گے۔ یاد رکھو کہ میری خواہش قانون کی طرح اٹل ہے"

فیروزہ بڑی فرمانبردار لڑکی تھی۔ اس نے اپنے دل پر جبر کر کے چچا کے مشورے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی سوچا۔ کہ تھوڑے عرصہ میں چچا کا غصہ فرو ہو جائے گا۔ اور مجھ پر سے یہ پابندی خود بخود اٹھ جائے گی۔

اسی طرح بہت عرصہ گذر گیا۔ آخر سلیم کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ خدا کی قدرت! بچہ پیدا ہوتے ہی سلیم کے برے دن آ گئے۔ اسے ایسی مالی مشکلات آ پڑیں کہ جن کا سامنا اس کے لئے بہت دشوار تھا۔ اب وہ ہر روز اپنے باپ کے دروازے کے سامنے سے گذرتا۔ لیکن باپ اس کی مدد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ فیروزہ گھر کے خرچ سے تھوڑا بہت جو کچھ بھی بچا سکتی۔ چوری چھپے کسی نہ کسی طریقے سے سلیم کے گھر پہنچا دیتی خود ان لوگوں کو بھی علم نہ تھا۔ کہ ہمارا محسن کون ہے۔ آخر ایک دن بہت ہی منحوس آیا۔ سلیم کو بخار ہوا۔ اور اس کا انتقال ہو گیا۔ ان دنوں فصلیں کٹ رہی تھیں۔

(۷)

فیروزہ عائشہ کے گھر گئی۔ عائشہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ اپنے بیٹے کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ فیروزہ نے پاس آ کر کہا۔ "میں اب تک اپنے چچا کا حکم بجالاتی رہی ہوں۔ میں گنہگار ہوں۔ کیونکہ پہلے پہل میری ہی وجہ سے سلیم مصیبت میں گرفتار ہوا۔ لیکن عائشہ! اس ہستی کی خاطر جو اب دوسری دنیا کو سدھار چکی ہے۔ اور اس عورت کی خاطر جسے اس نے اپنی دلہن منتخب کیا تھا۔ اور اس یتیم بچے کی خاطر جسے وہ چھوڑ گیا ہے میں یہاں آئی ہوں۔ تم جانتی ہو۔ پچھلے چند سالوں میں فصل بہت بُری ہوتی رہی ہے۔ اور اس سال خلافِ توقع فصل کی حالت بہت بُری نہیں۔ اپنا بچہ مجھے دے دو۔ میں اسے اس وقت اپنے چچا کی نظروں کے سامنے لے جاؤں گی۔ جب وہ اپنے غلے کے کھیتوں میں خوش خوش پھر رہا ہوگا۔ اس خوشی کی حالت میں شاید اسے اپنے پوتے کی صورت دیکھ کر رحم آجائے۔ اور وہ اسے اپنے پاس رکھنا منظور کر لے۔"

فیروزہ بچہ لے کر چل دی۔ اور غلے کے کھیتوں میں بچے کو گود میں لئے ایک ٹیلے پر بیٹھ گئی۔ اس ٹیلے پر کوئی فصل نہیں بوئی گئی تھی۔ البتہ سیلاب کے خوشنما پھولوں نے اسے رشکِ ارم بنا رکھا تھا۔ دُور دُور سے کسان آ کر ان کھیتوں کے قریب سے گذرتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے فیروزہ کو بچے سمیت وہاں بیٹھے دیکھ لیا تھا لیکن ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس کے چچا کو جا کر بتائیں۔ کہ اس کی بھتیجی سلیم کے بچے کو گود میں لئے اس کی آمد کے لئے چشم براہ ہے۔ فیروزہ وہاں سے .... اٹھ کر چچا کے پاس جانے کا ارادہ کر لی۔ لیکن ہمت اسے جواب دے دیتی۔ فصل

کاٹنے والے مزدور فصل کاٹ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ سورج غروب ہو گیا اور ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ لیکن فیروزہ اب بھی وہیں بیٹھی تھی۔

صبح ہوتے ہی وہ بستر سے اٹھ بیٹھی۔ اس نے دوبارہ بچے کو گود میں لیا اور اس ٹیلے پر آ بیٹھی۔ اس نے ارد گرد کے تمام پھول چن کر بچے کی ٹوپی میں لگا دیئے تاکہ وہ اپنے دادا کو زیادہ من موہنا نظر آئے۔

جب کسان کھیتوں کی طرف آنے لگے تو کچھ کسانوں کے ساتھ عبداللہ بھی وہاں آ نکلا۔ اس نے فیروزہ کو بیٹھے دیکھ کر اپنے ملازموں کو تو وہیں چھوڑا اور فیروزہ کے پاس آ کر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ "تم تمام شب کہاں رہیں؟ یہ کس کا بچہ ہے؟ اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

فیروزہ نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ اور نہایت ملائمت سے بولی "یہ سلیم کا بیٹا ہے"

اس کے ساتھ ہی اس کا چچا پکار اٹھا۔ "بتاؤ! کیا میں نے تمہیں منع کیا تھا یا نہیں۔ کہ ایسی حرکت نہ کرنا؟"

فیروزہ بولی۔ "میرے ساتھ جیسا سلوک آپ چاہیں کریں۔ لیکن اس معصوم بچے کو اس ہستی کی خاطر جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہمیں چھوڑ گئی ہے۔ اپنے پاس رکھ کر اس پر نگاہِ لطف کیجئے!"

عبداللہ غصے سے گرج کر کہنے لگا۔ "میں جانتا ہوں تم نے اور اس عورت نے باہم سوچ کر یہ چال چلی ہے۔ دیکھو خدا کی شان! تم اور مجھے اپنے فرائض انجام دینے کا سبق دو! اچھا میں تم سے زیادہ سختی کا سلوک نہیں کرونگا۔ بچہ تو مجھے دے دو۔ لیکن خود میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ آئندہ مجھے اپنی شکل تک نہ دکھانا۔"

یہ کہہ کر اس نے فیروزہ کی گود سے بچّہ لے لیا بچّہ رونے چلّانے لگا۔ اور اس نے عبداللہ کی گود سے نکلنے کے لئے بہت سے ہاتھ پاؤں بھی مارے۔ یہاں تک کہ اس کی ٹوپی میں گندھے ہوئے پھول فیروزہ کے قدموں میں آ گرے۔

عبداللہ کھیتوں میں بہت دُور نکل چکا تھا۔ لڑکے کی چیخوں کی آواز بتدریج کم ہوتی ہوئی آواز فیروزہ کو سنائی دے رہی تھی۔ فیروزہ کا سر جھک گیا تھا۔ اسوقت اس کے تصوّر میں وہ زمانہ تھا۔ جب وہ پہلے پہل اس گھر میں آئی تھی۔ گزرے ہوئے تمام واقعات کا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ وہ ایک گھنے کھیت میں مزدوروں کی نظروں سے چھپ کر چہرہ ہاتھوں میں چھپائے زار و قطار رونے لگی۔ کھیت کاٹنے والے مزدور کھیت کاٹ چکے تھے۔ سورج ڈوب گیا اور ہر سمت تاریکی چھا گئی۔

اب فیروزہ نے عائشہ کے گھر کی راہ لی۔ وہ اس کے مکان کے بڑے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ مصیبت زدہ عائشہ نے جب دیکھا۔ کہ بچّہ اس کی گود میں نہیں ہے تو اس کے منہ سے دعائیہ الفاظ فوارے کی طرح پھوٹ نکلے۔ کہنے لگی۔ "اے خدا! میں کن الفاظ میں تیرا شکر ادا کروں کہ تو نے بیوگی میں مجھ پر عنایت کی نظر کی۔"

فیروزہ بولی۔ "چچا جان بچے کو گود میں لے گئے ہیں۔ لیکن عائشہ! اب مجھے اپنے گھر میں رہنے اور یہیں کام کرنے کی اجازت دو۔ چچا جان اب عمر بھر میرا منہ نہ دیکھیں گے۔"

عائشہ نے جواب دیا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تم میری خاطر اتنی تکلیف کیوں برداشت کرو۔ اب میں اپنے بچّے کو چچا کے حوالے نہ کروں گی۔ وہ اسے بھی اپنی طرح

دوسروں پر سختی کرنا اور ماں سے نفرت کرنا سکھا دیں گے۔ آؤ ہم دونوں ان کے گھر چلیں۔ میں اپنا بچہ واپس لے آؤں گی۔ اور ان سے التجا کروں گی کہ تم کو واپس بلا لیں۔ اگر انہوں نے تم کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت نہ دی۔ تو پھر میں اور تم اس گھر میں اکٹھی رہیں گی۔ اور اس وقت تک بچے کی پرورش کے لئے کوئی کام کرتی رہیں گی۔ جب تک کہ وہ بڑا ہو کر ہماری مدد کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔"

دونوں نوخیز عورتوں نے ایک دوسری کا منہ چوم لیا۔ اور پھر عبداللہ کے مکان کی طرف چل پڑیں۔ جب وہاں پہنچیں۔ تو دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھلا تھا دونوں نے چوری چوری اندر جھانک کر دیکھا۔ کہ بچہ اپنے دادا کی گود میں بیٹھا ہے دادا نے اُسے سینے سے لگا رکھا ہے۔ اور اس کے گالوں پر ہلکے ہلکے چپت لگا رہا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا بھر کی محبت اس دادا کی آنکھوں میں سمٹ کر آ سمائی ہے۔ اور اسے وہ اپنے پوتے کے پھول سے چہرے پر نثار کر رہا ہے۔ بچے نے دونوں بازو اس مُہر کی طرف پھیلا رکھے تھے۔ جو اس کی گھڑی کی زنجیر سے بندھی آگ کے سامنے چمک چمک کر چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔

دونوں اب اندر داخل ہوئیں۔ جب لڑکے نے ماں کو دیکھا۔ تو وہ اس کے پاس جانے کے لئے رونے لگا۔ عبداللہ نے اسے اپنی گود سے نیچے اُتار دیا۔ عائشہ بولی۔ "ابا! — بشرطیکہ آپ مجھے ابا کہنے کی اجازت دیں — میں آپ کے پاس اپنے لئے۔ اس بچے کے باپ کے لئے یا اس بچے کے لئے بھیک مانگنے نہیں آئی ہوں۔ بلکہ میں صرف نیرونزہ کے لئے آپ سے ایک التجا کرنے کیلئے آپ کی خدمت میں پہنچی ہوں۔ اسے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دیجئے۔ اسے آپ

سے بے حد محبت ہے۔ ابا! جب اس بچے کے باپ نے وفات پائی۔ تو
اسے اپنے کسی عزیز سے بھی شکایت نہ تھی۔ اس نے مجھ سے بھی یہی الفاظ کہے
کہ "میں تم سے شادی کرکے کبھی نہیں پچھتایا۔" کیونکہ میں ایک صابر (شاکر) بیوی
ثابت ہوئی ہوں۔ لیکن ابا! مرتے وقت اس نے ایک اور بات بھی کہی وہ یہ کہ "
مجھے اپنے باپ کی حکم عدولی کرنے کا بڑا افسوس ہے۔ خدا ان پر اپنی برکتیں نازل کرے
خدا کرے انہیں کبھی معلوم نہ ہو کہ میں کن کن مصیبتوں میں مبتلا رہا ہوں۔" یہ الفاظ
کہہ کر اس نے کروٹ ہی لی تھی۔ کہ اس کی روح دوسری دنیا کو پرواز کر گئی۔ ابا! اب
مجھے میرا بیٹا واپس دے دیجئے۔ آپ اسے بھی دوسروں پر سختی کرنا سکھا دیں گے
اور وہ اپنے باپ کی یاد دل سے بھلا دیگا۔ فیروزہ کو اپنے پاس رکھ لیجئے۔ اور
ہمیں اپنی پہلی حالت پر چھوڑ دیجئے۔"

عائشہ نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ فیروزہ نے اپنا چہرہ اس کی اوٹ
میں چھپا لیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ یکایک بوڑھا عبداللہ پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگا۔ "یہ سب میرا قصور ہے...... یقیناً سب میرا قصور ہے
..... میں اپنے بیٹے کا قاتل ہوں..... میں نے اپنے بچے کو مار ڈالا.....
لیکن مجھے اس سے بے حد محبت تھی... میرے پیارے بیٹے! خدا مجھے معاف کرے
سب میرا قصور ہے۔ میرے بچو! آؤ اب تم میرے سینے سے لگ جاؤ۔

فیروزہ اور عائشہ بوڑھے عبداللہ کے پاس آکر کھڑی ہوگئیں۔ انہوں نے
متعدد بار فرط عقیدت سے اپنے معمر بزرگ کے ہاتھ چومے۔ انتہائی پشیمانی سے
بوڑھے کی جان ہی پر آ بنی تھی۔ بیٹے کی محبت اس کے دل میں ہزار گنا زیادہ ہو

گئی تھی ۔۔۔ اتنی کہ اس کے دل میں اس کی جگہ بھی نہ تھی۔ مسلسل تین گھنٹے تک وہ اپنے پوتے پر جھک کر اپنے نوجوان بیٹے کی یاد میں زار و قطار روتا رہا۔ اب یہ چاروں اسی مکان میں اکٹھے رہنے لگے۔ چند سال بعد عائشہ سلیم کی موت کا غم بھول گئی۔ اور اس نے دوسری شادی بھی کر لی۔ لیکن فیروزہ نے عمر بھر شادی کا نام نہ لیا۔

(لارڈ ٹینی سن)

اسرار

جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہ واقعہ ستمبر ۱۸۱۸ء میں پیش آیا تھا ــــــ لنکا شائر کے عین وسط میں "آس واربی ہال" کے سامنے ڈاک کی ایک گھوڑا گاڑی آ کر رُکی۔ گاڑی کے رُکتے ہی اس کا تنہا مسافر جو ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ کود کر باہر نکلا۔ اس نے آکر دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اور جب تک ہال کا دروازہ نہ کھلا۔ اِدھر اُدھر چاروں طرف حیرت اور استعجاب سے دیکھتا رہا۔

اس لڑکے کے سامنے اس وقت سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی مربع شکل کی ایک بلند عمارت تھی۔ جو ملکہ این کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس عمارت کیساتھ پتھر کے ستونوں والے ایک برآمدے کی بھی ابزادی کر دی گئی تھی۔ جو ۱۷۹۰ء کی قدیم طرزِ تعمیر کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ اس عمارت کی کئی ایک کھڑکیاں تھیں۔ بلند و بالا لیکن تنگ کھڑکیوں کے پٹوں میں چھوٹے چھوٹے شیشے لگے تھے۔ اور ان کی سفید لکڑی پر نقش و نگار کھدے تھے۔ ایک خوبصورت گول کھڑکی عمارت کے پیش رُخ کی شان

دوبالا کر رہی تھی۔ اس کے دونوں پہلوؤں پہ رنگین دیواروں والی غلام گردشیں بنی تھیں جن کے ستون انہیں عمارت کے مرکزی حصے سے ملا رہے تھے۔ عمارت کے پہلوؤں اصطبل اور گودام وغیرہ تھے۔ ہر پہلو پہ ایک ایک منقش گنبد بنا ہؤا تھا۔ اور ہر گنبد پر ایک ایک سنہری مُرغِ بادنما استادہ تھا۔

شام کی روشنی عمارت پر منعکس ہو رہی تھی۔ اور کھڑکیوں کے شیشے توجگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ ہال سے کچھ دور ہموار زمین پر ایک باغ لگا تھا جس میں جابجا بلوط کے درخت کھڑے تھے۔ باغ کے اردگرد صنوبر کے درختوں کی قطاریں ایک خوبصورت جھالر معلوم ہو رہی تھیں۔ گرجے کے مینار پر لگا ہؤا کلاک جو باغ کے درختوں میں پوشیدہ تھا چھ بجا رہا تھا۔ اور اس کی آواز تیز و تند ہوا کی سرسراہٹ کو پہنچا تکھائی ہوئی فضا میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ سنہری مُرغ باد نما شام کی روشنی میں جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔

لڑکے کو جو ڈیوڑھی میں کھڑا کھڑا دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ غم آلود مناظر بہت دلفریب معلوم ہو رہے تھے۔ حالانکہ ایسے اداس مناظر تو خزاں کی کسی شام کو زیب دیتے ہیں۔

وُہ وارِوک شائر سے ڈاک کی اس گاڑی پر بیٹھ کر آیا تھا۔ آج سے چھ ماہ پہلے وہ یتیم ہوگیا تھا۔ اب اس کے سن رسیدہ چچیرے بھائی مسٹر ایبنی نے ازراہِ کرم اسے اپنے پاس استوار بی میں بلا لیا تھا۔ یہ بلاوا بالکل غیر متوقع تھا۔ کیونکہ جن لوگوں کو مسٹر ایبنی کی ذات کے متعلق تھوڑی بہت معلومات بھی حاصل تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ وہ حیرت انگیز طور پر گوشہ نشین واقع ہؤا ہے اور اس کے خلوت کدے میں یہ چھوٹا

سالڑکا ایک تکلیف دہ مداخلت متصور کیا جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت کم لوگ مسٹر ایبنی کے مشاغل اور اس کی افتاد طبیعت سے واقف تھے کیمبرج یونیورسٹی کا یونانی کا پروفیسر ایک مرتبہ یہ کہتے ہوئے سنا گیا۔ تھا کہ عا بیدر پیگن ازم" کے متعلق جتنی معلومات" آس وابی" کے مالک کو ہیں اور کسی کو نہیں۔ اور درحقیقت اس کی لائبریری" اسرار افلاطونیت" اور پُر اسرار فنون کی وہ تمام کتابیں موجود تھیں۔ جو اس زمانے میں مہیا ہو سکتی تھیں۔ اس کے بڑے ہال میں جس کا فرش سنگِ مرمر کا تھا۔ جادو کے دیوتا کا ایک بت کھڑا تھا۔ جو اس نے بہ صرفِ زرِ کثیر لیوانت سے منگوایا تھا۔ اس دیوتا کے متعلق اس کا ایک تفصیلی مضمون "جنٹلمین میگزین" میں شائع ہوا تھا۔ اور وسطی رُوما کے باشندوں کے توہمات کے متعلق "کریٹیکل میوزیم" میں بھی اس کے کئی مضامین قسط وار شائع ہو چکے تھے۔

لوگ اسے پرانی اور پُر اسرار کتابوں کا کیڑا سمجھتے تھے جسے کتابوں کی دُنیا سے باہر آنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ اُسے کبھی اپنے چھوٹے سے چچیرے بھائی" اسٹیفن ایلیٹ" کے یتیم ہونے کی خبر ہو سکتی ہے۔ جب انہوں نے سُنا کہ وہ اس یتیم کو اپنے پاس بلا رہا ہے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

مسٹر ایبنی کے متعلق اس کے ہمسایوں کا خواہ کچھ ہی خیال کیوں نہ ہو۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ یہ بلند قامت دبلا پتلا گوشہ نشین انسان اپنے ننھے سے بھائی کا مخلصانہ استقبال کرنے پر تیار نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ جونہی سامنے کا دروازہ کھلا وہ کتابیں چھوڑ کر خوشی سے ہاتھ ملتا ہوا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے منہ سے خیر مقدم کے الفاظ کا دریا بہہ نکلا

"میرے ننھے بچے کہو۔ اچھے تو ہو؟ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ اس طویل سفر میں تم بہت زیادہ تھک تو نہیں گئے؟ تم نے بہت طویل سفر کیا ہے اسلئے تمہیں بھوک تو لگی ہوگی۔؟"

"شکریہ۔ میں بالکل اچھا ہوں" ماسٹر ایلیٹ نے جواب دیا۔

"تم بہت اچھے بچے ہو۔ اور تمہاری عمر کتنی ہے؟" مسٹر لیمنی نے دوبارہ کہا۔

اس دونٹ کی پہلی ملاقات میں اس سوال کی تکرار کچھ عجیب سی معلوم ہوئی بہر حال اسٹیفن کہنے لگا کہ "اس سالگرہ کو میں بارہ سال کا ہو جاؤنگا۔"

مسٹر لیمنی نے پوچھا۔ "تمہاری سالگرہ کب ہے؟"

سٹیفن نے جواب دیا۔ "۱۱ ستمبر کو۔"

"بہت خوب! بہت خوب! گویا تمہاری سالگرہ میں قریب قریب ایک سال باقی ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے نا؟؟ میں یہ باتیں اپنی کتاب میں لکھونگا۔ بارہ سال کی ہوگی نا تمہاری عمر؟ ہیں؟"

"جی ہاں بارہ سال"

"خوب! خوب! تو پارکس۔ تم اسے مسز بنچ کے کمرے میں لے جاؤ۔ اور اسے چائے اور کھانا یا جو کچھ بھی ہو کھلا دو!"

"بہت بہتر" کہہ کر پارکس بچے کو "طبقات زیرین" میں لے گیا۔

اسٹوابی حال میں اسٹیفن اب تک جن جن اشخاص سے ملا۔ ان سب سے زیادہ آرام دہ اور مخلص مسز بنچ تھیں۔ وہ اس ننھے مہمان سے کچھ اس طرح پیش آئیں کہ اسے اجنبی گھر اپنا گھر معلوم ہونے لگا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر یہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے اور گہرے دوست رہے۔

مسز بنچ اسٹیفن کی آمد سے کوئی پچپن برس پہلے پیدا ہوئی تھیں اور بارہ سال سے یہیں اقامت پذیر تھیں ۔اس گھر کے سیاہ سفید سے اگر کوئی واقف تھا۔تو وہ صرف مسز بنچ تھیں۔

اس عمارت اور اس عمارت کے باغ کے متعلق سینکڑوں باتیں دریافت طلب تھیں ۔اور سٹیفن جس کی طبیعت میں چھان بین کرنے اور دقیق سے دقیق باتیں سمجھنے کا مادہ قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا۔اس عمارت اور اس کے گرد و نواح کے اسرار و رموز کو بخوبی سمجھنا چاہتا ہوں ۔وہ بار بار کہتا۔وہ بیلوں کی قطار کے سرے پر مندر کس نے بنایا ہے ؟ وہ کون بوڑھا ہے ۔جس کی تصویر زینے میں ٹنگی ہے ؟ اس نے اپنے ہاتھ میں انسان کی ایک کھوپڑی کیوں پکڑ رکھی ہے ؟" — اپنی زبردست دماغی قوت کی مدد سے مسز بنچ نے ان تمام سوالات کا تسلی بخش جواب دیکر اسے مطمئن کر دیا۔لیکن کئی سوال ایسے بھی تھے۔جن کے جواب سے سٹیفن کو پوری تسلی نہیں ہوئی تھی۔

نومبر کی ایک شام کا ذکر ہے۔سٹیفن باورچی خانے میں آگ تاپتے ہوئے اپنے گرد و پیش کی چیزوں کے متعلق کچھ سوچ رہا تھا۔یکایک وہ مسز بنچ سے پوچھنے لگا۔"کیا مسٹر ایبنی اچھے آدمی ہیں ؟ کیا وہ بہشت میں داخل ہو سکیں گے ؟"

ہاں ہاں ! بہت اچھے آدمی ہیں۔کیا تمہیں میں نے اس چھوٹے سے لڑکے کے متعلق ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔جسے مسٹر ایبنی آج سے سات سال پہلے بازار سے اپنے گھر لے آئے تھے ؟ کیا میں نے تمہیں اس لڑکی کی کہانی نہیں سنائی ۔جسے وہ میرے آنے سے دو سال پہلے یہاں لائے تھے ؟"

نہیں نہیں مسز بنچ ! آپ نے ان دونوں کے متعلق مجھے کچھ نہیں بتایا۔اب

بتائیے ساری بات!"

"بہت بہتر!" مسز مینچ نے کہا۔ "لڑکی کے متعلق سارا واقعہ تو مجھے یاد نہیں۔
البتہ اتنا یاد ہے کہ ایک مرتبہ مسٹر ایمپی سیر کرنے گئے اور اپنے ساتھ ایک بچی لے
آئے۔ جیسے آتے ہی انہوں نے اپنی باورچن مسز ایلیس کے سپرد کر دیا۔ اور تاکید کردی کہ وہ
اس کی اچھی طرح خبر گیری کرے۔ اس غریب بچی کے پاس اپنی تو ایک چیز بھی نہ تھی۔
اس نے یہ بات خود مجھے بتائی تھی۔ تین ہفتے وہ ہمارے ساتھ ہنسی خوشی رہی۔ لیکن
شاید اس کی رگوں میں خانہ بدوشوں کا خون دوڑ رہا تھا۔ ایک دن صبح ہی صبح اس سے
پہلے کہ ہم میں سے کسی کی آنکھ کھلے۔ وہ اپنے بستر سے غائب پائی گئی۔ اس وقت سے لیکر
اب تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ مسٹر ایمپی نے اس کی تلاش میں چپہ چپہ چھان مارا۔
تمام تالاب تک چھنوا دیئے۔ لیکن بچی کہیں سے دستیاب نہ ہوئی۔ میرا خیال ہے اسے
خانہ بدوش اُٹھا لے گئے ہونگے۔ کیونکہ جس رات وہ غائب ہوئی۔ اس رات تقریباً ایک
گھنٹے تک ہمیں خانہ بدوشوں کے گیت گانے کی آوازیں آتی رہیں۔ بڑی پیاری بچی تھی۔
ہر وقت چپ چاپ رہتی تھی۔ لیکن وہ ہم لوگوں سے اس قدر گھل مل گئی تھی۔ کہ
مجھے تعجب ہوتا ہے۔ کہ اس نے ہماری جدائی کس طرح برداشت کی ہو گی۔"

"اور اس لڑکے کا کیا حشر ہوا؟" سٹیفن نے پوچھا۔

"آہ غریب لڑکا!" مسز مینچ نے جواب دیا۔ "وہ بیچارہ غریب الوطن تھا۔ اس
کا نام جیوانی تھا۔ اسے ہمارا آقا موسم سرما کی ایک صبح کو ساتھ لایا تھا۔ اسے اس
کے متعلق تمام معلومات حاصل تھیں کہ وہ کہاں سے آیا۔ اس کی کتنی عمر ہے۔ اس کے
رشتہ دار کہاں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ ایک صبح کو وہ بھی لڑکی

طرح غائب ہو گیا۔ اس کے پاس ایک چکارا بھی تھا۔ اور جب اسے ہمارا آقا ساتھ لایا تو وہ چکارا بجا رہا تھا۔ لیکن یہاں آکر اس نے کبھی اپنا چکارا نہ بجایا۔ وہ چکارا اب تک الماری میں پڑا ہے۔

شام کا باقی حصہ سٹیفن نے منز بیچ پر مختلف قسم کی جرح کرنے یا چکارے کے تاروں سے نغمے نکالنے کی کوشش میں گزار دیا۔

اس رات اس نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ گھر کی اوپر کی منزل میں جہاں اس کی خواب گاہ تھی۔ وہاں ایک غیر مستعمل غسل خانہ بھی تھا۔ اسے ہمیشہ قفل لگا رہتا تھا۔ اس کے دروازے کے بالائی نصف حصے پر تنگ کیا گیا تھا۔ چونکہ دروازہ پردوں کی قید سے آزاد تھا۔ اس لئے ایک ہی نگاہ اندر ڈال کر معلوم ہو سکتا تھا۔ کہ اس غسل خانے کی دائیں دیوار میں پانی کی ٹونٹی نصب ہے۔ جو کھڑکی کی طرف نکلتی ہے۔

اس رات جس کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ اسٹیفن ایلیٹ نے اپنے آپ کو ننگا دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے پایا۔ کھڑکی میں چاند چمک رہا تھا۔ اس وقت اس کی نظر کے سامنے ایک چیز تھی۔ جو غسل خانے میں پڑی تھی۔

اسٹیفن نے جو کچھ دیکھا۔ اس کی تفصیلات نے مجھے ایک پرانا واقعہ یاد دلا دیا۔ یہ واقعہ مجھے ڈبلن کے مشہور گرجے سینٹ مائکن میں پیش آیا۔ اس گرجے میں سینکڑوں سال کی پرانی لاشوں کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے رکھا گیا تھا۔ گویا یہ گرجا لاشوں کا ایک خزانہ تھا۔ اس کمرے میں سٹیفن نے ایک دبلا پتلا انسانی ہیولیٰ دیکھا جو ایک کفن نما کپڑے میں لپٹا تھا۔ اور جس کی حالت بہت قابل رحم تھی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کی خمیدگی ایک خفیف اور خوفناک تبسم کا اظہار کر رہی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے زور سے اپنا دل تھام رکھا تھا۔
جونہی اسٹیفن کی نظر اس ہیولیٰ پر پڑی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک ناقابل شنید ہلکی ہلکی دردناک آواز نکلنے لگی۔ اور اس کے بازو ہلنے لگے۔ اس منظر کی تاب نہ لاکر سٹیفن دفعتاً پیچھے ہٹ گیا۔ یکایک اس پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی۔ کہ وہ اوپر جانے والے راستے کے سرِ فرش پر کھڑا ہے۔ اور چودہویں کا چاند پوری تابانی سے چمک رہا ہے۔
اس عمر کے لڑکوں میں اگرچہ ایسی جرأت مفقود ہوتی ہے۔ تاہم وہ ہمت کرکے غسل خانے کے دروازے تک گیا کہ معلوم کرسکے آیا وہ اس خوابگوں ماحول میں جو ہیولیٰ اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی موجود ہے۔ لیکن جب وہ گیا۔ تو وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے بستر پہ واپس چلا آیا۔
صبح لڑکے نے یہ سارا واقعہ مسز بیچ کو سنا دیا۔ وہ اس کی باتیں سنکر بہت متاثر ہوئیں۔ بلکہ انہیں کچھ ایسا وہم ہوا کہ وہ غسل خانے کے دروازے تک چلی گئیں۔ صبح ناشتہ کے وقت جب سٹیفن نے اپنے تجربات اور مشاہدات سے مسٹر ایبنی کو آگاہ کیا۔ تو اس نے اس کی باتیں بہت دلچسپی سے سنیں اور اس واقعہ کے متعلق "اپنی کتاب" میں نوٹ لکھ لئے۔
بہار کا معتدل موسم شروع ہوچکا تھا۔ اب مسٹر ایبنی نے اپنے چچازاد بھائی کو بار بار یہ سبق پڑھنا شروع کیا۔ کہ "جو کچھ تم نے دیکھا ہے۔ اس کے بارے میں تمام دانشمندوں کا خیال ہے کہ جب بچے کوئی ایسا منظر دیکھیں۔ تو ان کے لئے یہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ اپنی پوری طرح سے نگرانی رکھیں اور رات کو اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کرکے سویا کریں۔" مسٹر ایبنی نے یہ بھی

کہا کہ "سین سورنس نے اس مسئلے پہ بہت روشنی ڈالی ہے"۔

اب اس مکان میں سٹیفن کئی حادثات سے دوچار ہو چکا تھا۔ اور اس کے دماغ پہ ان حادثات کا گہرا اثر پڑ چکا تھا۔

اسی شام مسز پنچ سٹیفن کے پھٹے ہوئے نائٹ گون کی مرمت کرنے لگیں۔ جب سٹیفن ان کے پاس آیا۔ تو وہ غصے سے کہنے لگیں "یہ تم اپنے شب خوابی کے لباس کی دھجیاں کیوں روز اڑا دیتے ہو۔ تم تو شب خوابی کا لباس تار تار کر کے اسے پھینک جاتے ہو۔ بعد میں بچارے نوکروں کو کئی کئی گھنٹے اس کی مرمت کرنی پڑتی ہے"

اس کی قمیص بائیں جانب سے بڑے عجیب و غریب طریقے سے جا بجا پھٹی ہوئی تھی۔ اور اسے سینا کسی بڑے سلیقہ مند آدمی کا کام تھا۔ قمیص کا پھٹا ہوا حصہ عین دل پر تھا۔ اسٹیفن کا بیان تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ یہ قمیص کس طرح پھٹی ہے۔ اسٹیفن نے یہ بھی کہا کہ "تعجب ہے آج میری خوابگاہ کے دروازے پر بھی کچھ ایسے نشانات پائے گئے۔ جیسے اسے کوئی بلی اپنے پنجوں سے نوچتی رہی ہے۔"

مسز پنچ اسٹیفن کا بیان سن کر حیرت زدہ ہو گئیں۔ انہوں نے ایک مشعل ہاتھ میں لی اور جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اور اسٹیفن کو ان کے سیڑھی پر چڑھنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آ گئیں۔ اور کہنے لگیں۔ "ماسٹر سٹیفن میں حیران ہوں کہ اس قسم کے نشانات کس طرح دروازے پہ پڑ گئے ہیں۔ یہ نشانات دروازے کے کافی بلند حصے پر ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ کسی بلی کتے یا چوہے کا کام نہیں ...... یہ نشانات تو کچھ عجیب پراسرار سے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں مسٹر ایبنی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں

تم اپنی خواب گاہ کے دروازے کو چٹخنی لگا کر سویا کرو۔"

اسٹیفن کہنے لگا۔ "میں تو ہمیشہ سونے سے پہلے خدا سے دُعا مانگتا ہوں۔ اور پھر دروازے کی چٹخنی لگا کر سو جاتا ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کیا ماجرا ہے۔"

مسز بنچ نے جواب دیا۔ "شاباش، بیٹا شاباش! تمام اچھے بچے سونے سے پہلے دعا مانگ لیتے ہیں اور اگر تم ہر روز ایسا ہی کرو۔ تو پھر تمہیں کوئی چیز گزند نہیں پہنچا سکتی۔"

اس کے بعد وہ ماسٹر اسٹیفن کے پھٹے ہوئے شب خوابی کے لباس کی مرمت کرنے لگیں اور اس وقت تک اس کی مرمت کرتی رہیں جب تک کہ سونے کا وقت نہ ہو گیا۔ سٹیفن کے بیانات سننے کے بعد وہ بار بار خیالات میں ڈوب جاتی تھیں یہ واقع مارچ ۱۸۱۲ء میں ۹ بجے شب کو پیش آیا۔

دوسرے دن شام کو مسز بنچ نوکروں سے برتن صاف کرا رہی تھیں۔ کہ پارکس ان کے پاس آیا۔ اسے علم نہ تھا۔ کہ سٹیفن بھی اس وقت موجود ہے۔ اور وہ مسز بنچ سے اس گھر کے خوفناک ماحول کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ اس نے مسز بنچ کو بتایا کہ "میں نے آج بڑے کمرے میں عجیب و غریب آوازیں سنیں۔ اور جب میں نے ایک سوراخ سے جھانکا۔ تو یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کہ چند چوہے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ کیا مسز بنچ آپ نے بھی کبھی چوہوں کو انسانی بولی بولتے سُنا ہے"

مسز بنچ کہنے لگیں۔ "بھئی اس کمرے میں ایسی عجیب و غریب آوازیں تو میں بھی سُن چکی ہوں۔ حیران ہوں کہ یہ کیا بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس گھر میں ہمارے علاوہ بھوت پریت بھی رہتے ہیں۔"

پارکس کہنے لگا۔ "مسز پنچ! بڑے کمرے ہی پہ کیا موقوف ہے۔ میں نے تو گودام میں بھی چیخوں کی آواز سنی ہے۔"

یکایک مسز پنچ کی نظر سٹیفن کے گھبرائے ہوئے چہرے پر پڑی اور کہنے لگیں "پارکس! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہاری باتیں اس بچے کو خوفزدہ کر رہی ہیں۔"

پارکس چونک کر کہنے لگا۔ "اوہو! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔ ماسٹر سٹیفن! مسز پنچ سے میں نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ سب جھوٹ ہے کہیں تم ان باتوں پر یقین نہ کر لینا۔"

ننھا سٹیفن ان دونوں کے دھوکے میں آگیا۔ اور کہنے لگا "مجھے تو پہلے ہی ان باتوں پہ کوئی یقین نہیں تھا۔"

۲۴ مارچ ۱۸۱۲ء سٹیفن کے لئے ایک عجیب وغریب اور پُراسرار دن تھا۔ اس دن اس پر کئی نئے انکشاف ہوئے۔ یہ دن ویسے بھی بہت عجیب وغریب تھا۔ ہلکی ہلکی آندھی چل رہی تھی۔ اور درختوں کے پتوں سے چیخوں کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سٹیفن جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر باغ کا منظر دیکھنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے اس وقت باغ میں بھوت ناچ رہے ہیں۔ اور جب کوئی باغ میں داخل ہوتا ہے تو اُسے پکڑنے چلتے ہیں۔

اس دن لنچ کے بعد مسٹر ایبنی نے سٹیفن کو اپنے پاس بلایا اور رازدارانہ لہجہ میں اس سے کہا "میرے پیارے بچے! آج گیارہ بجے شب کو تم میرے کمرے میں آنا۔ مجھے تم سے ضروری کام ہے۔ میں تمہیں اس سے پہلے ہی بلا لیتا۔ لیکن میں سخت مصروف ہوں۔ میں تمہیں تمہاری آئندہ زندگی کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہوں اور یہ بات تمہیں

آج معلوم ہو جانی چاہیئے۔ لیکن تم مسز بنچ یا گھر کے کسی اور آدمی کو مت بتانا کہ میں نے تمہیں بلایا ہے تم وقت مقررہ پر اپنے کمرے میں چلے جانا اور جب گیارہ بجیں تو میرے کمرے میں آ جانا!"

جب سٹیفن اپنے کمرے میں جانے کیلئے زینے پر چڑھا تو اس کی نظر لائبریری کے بڑے کمرے میں پڑی، آتش دان کے سامنے ایک انگیٹھی پڑی تھی۔ جس میں کوئلے دھک رہے تھے۔ یہ انگیٹھی وہ پہلے بھی یہاں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ میز پر ایک چمکدار پیالہ پڑا تھا جس پر چاندی کا ملمع کیا گیا تھا۔ یہ پیالہ سرخ شراب سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے قریب کچھ کاغذات رکھے تھے۔ مسٹر ایبنی نے جو چاندی کے ایک گول ڈبے سے کوئی چیز نکال نکال کر کوئلوں پر چھڑک رہا تھا۔ سٹیفن کے قدموں کی آواز نہ سُنی اور اپنا کام برابر جاری رکھا۔

اس وقت آندھی کا زور قدرے کم ہو گیا تھا۔ اور آسمان پر چمکتا ہوا چاند نکل آیا تھا

دس بجے کے قریب سٹیفن اپنی خوابگاہ کی کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑا باغ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ لیکن اس وقت جن دُور دراز اور پُر اسرار جنگلوں پر چاند چمک رہا تھا۔ ان کی پُر اسرار مخلوق ابھی تک محوِ خواب نہیں ہوئی تھی۔

سٹیفن کو سامنے کے تالاب کے اس طرف راستہ بھولے ہوئے مسافروں کی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اگرچہ یہ مسافر صرف اس کے تخیّل کی دُنیا ہی میں تھے ممکن ہے یہ آوازیں اُلّوؤں یا آبی پرندوں کی ہوں۔ لیکن سٹیفن کو یہ آوازیں راستہ بھولے ہوئے مسافروں کی چیخوں کے مشابہ معلوم ہوئیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ آوازیں قریب آتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ لیکن اب جس طرح یہ آنی شروع ہوئی تھیں۔ اسی طرح یہ غائب بھی ہونے لگیں۔ اور رفتہ رفتہ بالکل غائب ہو گئیں۔

لیکن جونہی سٹیفن کھڑکی بند کر کے "روبن کروسو" پڑھنے کے لئے اپنے بستر

پر جانا چاہتا تھا۔ اسے پچونترے میں وہ شکلیں نظر آئیں۔ جو کچھ دیر بعد دوڑ کر باغ کے اس حصے میں چلی گئیں۔ جو ہال کے سامنے تھا۔ سٹیفن کو معلوم ہوا جیسے وہ پہلو بہ پہلو کھڑی ہو کر کھڑکیوں کی طرف تاک رہی ہیں۔ اور ان میں سے ایک لڑکا اور دوسری لڑکی تھے۔

لڑکی ہاتھ باندھ کر ساکت و صامت کھڑی ہو گئی۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے وہ مسکرا رہی ہے۔ لڑکا جو نسبتاً دبلا پتلا تھا۔ شاید پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس کے چہرے پر فاقوں کی وجہ سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کے شفاف ہاتھوں پر چاند چمک رہا تھا۔ سٹیفن کو اس کے خوفناک طور پر بڑے بڑے لمبے ناخن دکھائی دینے لگے جب وہ اپنے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھا کر کھڑا ہوا۔ تو سٹیفن نے ایک خوفناک منظر دیکھا اس کے سینے کی بائیں جانب اسے زخم کا ایک سیاہ نشان نظر آیا۔ اب سٹیفن نے محسوس کیا کہ شام کو اس نے جنگلوں میں جو چیخیں سنی تھیں وہ شاید اسی لڑکے کی تھیں۔

سٹیفن یہ منظر دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا۔ بہر حال اب وہ ہاتھ میں شمع لے کر مسٹر ایبنی کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ کیونکہ اب گیارہ بجنے میں بہت تھوڑا وقت باقی رہ گیا تھا۔

مسٹر ایبنی کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ سٹیفن نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک مرتبہ دو مرتبہ اور پھر تیسری بار لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ مسٹر ایبنی مصروف تھا۔ وہ بول رہے تھے۔

—"یہ مسٹر ایبنی چلانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں" سٹیفن نے اپنے دل میں سوچا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُن کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔ کیا انہوں نے بھی ان عجیب و غریب بچوں کو دیکھا ہے۔ اور دہشت زدہ ہو گئے ہیں؟ تھوڑی دیر بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ تو سٹیفن نے جی کڑا کر کے کواڑ کو زور سے دھکا دیا۔ اور وہ کھل گیا۔

مسٹر ایبنی کے کمرے میں میز پر کچھ کاغذ پڑے تھے۔ جنہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے اور پڑھنے سے سٹیفن تمام صورت حالات سے واقف ہوگیا۔ اگرچہ وہ ایک نوعمر لڑکا تھا لیکن اس میں اتنی سمجھ ضرور تھی۔ کہ وہ ان مسودات کا مطلب سمجھ سکے۔

ان مسودات کی عبارت بہت سادہ اور مختصر تھی۔ اور اہم ترین فقرات یہ تھے۔

" ازمنۂ قدیم کے ساحروں نے عجیب و غریب روحانی قوتیں حاصل کرنے اور معجزے دکھانے کی قوت پیدا کرنے کیلئے ایک خاص عمل تجویز کیا ہے یہ عمل موجودہ وقت کے انسانوں کے نزدیک خواہ کس قدر بھیانک اور ظاہر ہو لیکن اس کے نتائج ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ اس عمل میں چند انسانی ہستیاں موت کے گھاٹ اتارنی پڑتی ہیں اور جب ایک آدمی اس عمل میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو وہ ان تمام قوتوں پر قابو پا لیتا ہے۔ جن کے ہاتھ میں نظام قدرت کی باگ ڈور ہے۔

چنانچہ سائمن منگوز کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہوا میں اڑ سکتا تھا۔ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتا تھا۔ اور جو شکل چاہتا۔ اختیار کر لیتا۔ اس نے بھی ایک لڑکے کو قتل کر کے اس کی روح سے یہ کام لیا تھا۔ قدیم زمانے کا مشہور ساحر ہیرز ٹریگسٹس اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے کہ "یہی کام ایسے لڑکوں سے بھی لئے جاسکتے ہیں۔ جن کی عمر اکیس سال سے کم ہو۔ ان لڑکوں کے دل ان کے سینے سے نکال کر اپنے جسم میں جذب کر لئے جاتے ہیں"

"میں نے جسم میں بچوں کے دل جذب کرنے کے متعلق تحقیقات کرنے میں اپنی عمر کے بیس سال صرف کر ڈالے ہیں۔ اور کوشش کی ہے۔ کہ ایسے بچے حاصل کئے جائیں جن کا کوئی والی وارث نہ ہو۔ تاکہ میرا خوفناک راز منکشف نہ ہو جائے۔

۲۴۔ مارچ ۱۷۹۲ء کو میں ایک حبشی لڑکی چرا لایا تھا۔ اور میرا دوسرا شکار لڑکا گوانی یا ڈلی

نامی ایک اطالوی لڑکا تھا۔ اس کو میں ۲۳ مارچ ۱۸۰۵ء کی رات کو چرایا تھا۔ ان دونوں کے دل میں کر میں اپنے جسم میں جذب کر چکا ہوں۔ اب مجھے تیسرے بچے کی ضرورت ہے۔ اس بچے کا دل اپنے جسم میں جذب کرنے کے بعد میں ایک مکمل ساحر بن جاؤنگا۔ اور مجھ میں معجزے دکھانے کی قوتیں پیدا ہو جائیں گی۔ اس مقصد کے لئے اب کی مرتبہ میں نے اپنے چچازاد بھائی سٹیفن ایلیٹ کو منتخب کیا ہے۔ ۲۴ مارچ کو میں اس کے سینے سے دل نکال لوں گا۔

دل کو اپنے جسم میں جذب کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ پہلے بچے کے پہلو سے دل نکالا جائے۔ اس دل کو انگاروں پر بھون کر اس کی راکھ بنائی جائے۔ اور پھر اسے شراب میں حل کر لیا جائے۔ اور جن بچوں کا دل نکالا جائے۔ اُن کی لاشیں کسی تاریک کمرے یا گودام میں رکھ دی جائیں۔ ان بچوں کی روحیں آکر عامل کو ستا تو سکتی ہیں۔ لیکن مجھ جیسے فلاسفر کو تو ان باتوں پر یقین ہی نہیں۔ اس کے علاوہ ننھے ننھے بچوں کی رُوحوں کو کیسے جرأت ہو گی۔ کہ وہ مجھ جیسے بارعب آدمی پر حملہ کریں۔ مجھے ان باتوں کی ذرہ بھر بھی پروا نہیں مزید برآں جب میں اپنے عمل میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ تو پھر مجھے موت کا اندیشہ ہی کیا ہے۔ مجھے تو کوئی چیز گزند نہیں پہنچا سکتی۔"

سٹیفن نے دیکھا کہ مسٹر ایبنی ——— ظالم ایبنی ——— اپنی کرسی پر بے حس و حرکت پڑا ہے۔ اس کا سر پیچھے کی طرف لٹک گیا ہے۔ اس کے چہرے پر غصّے، دہشت اور درد و کرب کے آثار نمایاں ہیں۔ اس کے سینے کی بائیں جانب عین دل کے مقام پر ایک خوفناک گہرا شگاف پڑ گیا ہے۔ لیکن

اس کے ہاتھوں پر خون کا کوئی نشان نہیں۔ اور میز پر جو لمبا سا چمکیلا چاقو پڑا ہے۔ وہ بھی خون آلودہ نہیں بلکہ بالکل صاف ہے۔

لوگ کہنے لگے۔ شاید کسی جنگلی بلی نے مسٹر ایبنی کا دل نکال لیا ہے۔ کیونکہ اس کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہے۔ یا شاید کوئی جنگلی جانور کمرے میں آ داخل ہوگا۔ اور اسے موت کے گھاٹ اتار کر چل دیا ہوگا۔" لیکن سٹیفن ایلیٹ مسٹر ایبنی کے مسودات پڑھ چکا تھا۔ اس لئے اس کی رائے لوگوں سے مختلف تھی۔

(ترجمہ بہ ترمیم)

(ڈاکٹر ایم۔ آر۔ جیمز)

آج سے کچھ مدت پہلے کا ذکر ہے۔ کہ میری تحریروں نے عوام کو میرے سخت برخلاف کر دیا۔ جب اخبارات و رسائل نے شدید نکتہ چینی کے لیے بھی مجھی کو منتخب کیا۔ تو میں نے یہی مناسب سمجھا۔ کہ کسی پُرسکون اور اجنبی مقام پر چلا جاؤں اور کوشش کروں کہ عوام تو کُجا خود مجھے بھی کچھ عرصے کے لیے اپنے کو یکسر فراموش کر دینے کا موقع ملے۔

کلکتہ کے نواح میں میرا ایک گاؤں ہے۔ جہاں میں دنیا والوں کا ہدفِ ملامت بننے سے بچ کر رہ سکتا ہوں۔ گاؤں والوں نے فی الحال میرے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی۔ وہ جانتے ہیں کہ گاؤں میں رہنے سے میرا مقصد محض عیش و عشرت نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں نے اپنے گاؤں کو شہر میں بسنے والوں کے شور و شغب سے کبھی برہم نہیں کیا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ایک تارک الدنیا نہیں۔ انہیں میرے قرب و آرام و آسائش کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔ انہیں مجھ پر

سیاح کا دھوکا بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگرچہ میں فطرۃً آوارہ گرد واقع ہوا ہوں لیکن میرا کام صرف گاؤں کے کھیتوں کے ارد گرد چکر لگانا ہوتا ہے۔

گاؤں والوں کو یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ میری شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔ کیونکہ انہوں نے کبھی مجھے اپنے بچوں کے ساتھ نہیں دیکھا۔ میں ان کے لئے ایک ایسا معمہ ہوں جو حل نہ ہو سکے۔ ایک مدت سے انہوں نے میرے متعلق کچھ سوچنا یا میرے متعلق کوئی رائے قائم کرنا ترک کر دکھا ہے۔

لیکن تھوڑے ہی دن ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ گاؤں میں کم از کم ایک متنفس ایسا بھی ہے جسے مجھ سے انتہائی دلچسپی ہے۔ اس سے میری پہلی ملاقات موسم گرما کی ایک سہ پہر کو ہوئی۔ صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ اور اس وقت کہر نے فضا کو نم آلود اور بوجھل بنا رکھا تھا۔

میں ایک چتکبری گائے کی طرف جو دریا کے کنارے چر رہی تھی۔ دیکھ رہا تھا۔ اس کے چمکیلے جسم کو سورج کی شعاعیں چوم رہی تھیں۔ گائے کے قدرتی لباس کی طرف دیکھ دیکھ کر میرے دل میں عجیب و غریب خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اپنے جسم کو قدرتی لباس سے محروم کر کے کپڑے مہیا کرنے میں کس قدر اسراف سے کام لیتا ہے۔

میں اس قسم کے خیالات میں محو تھا۔ کہ ادھیڑ عمر کی ایک عورت میرے سامنے آ کر جھک گئی۔ اور میرے دیکھتے دیکھتے اس نے مجھے سجدہ کیا۔ اس کی جھولی میں کچھ پھول تھے۔ جن میں سے اس نے میرے ہاتھ میں کچھ دیدیئے۔ اور پھر با ادب دست بستہ کھڑی ہو گئی۔ پھول پیش کرتے وقت اس نے مجھ سے جو الفاظ کہے وہ مجھے

"یہ ناچیز ہدیہ اپنے معبود کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ لیکن اس کے الفاظ نے میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل مچا دی۔ میں اس قدر گھبرا گیا کہ اس کے لوٹنے سے قبل میں اس کے چہرے پر ایک نگاہ بھی نہ ڈال سکا۔ اگرچہ یہ واقعہ بظاہر مجھے بالکل معمولی معلوم ہوتا تھا۔ مگر میرے دل پر اس نے گہرا اثر کیا۔ وہ چلی گئی تھی۔ اور اب صرف وہ گائے میرے سامنے تھی جسے میں دیکھ رہا تھا۔ اور جو گھاس چرنے میں مصروف تھی۔ اب مجھے اس گائے کا وجود بھی پُر اسرار معلوم ہونے لگا۔ شاید آپ مجھ پر ہنسیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت میرا دل خدا کی تعریف کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ مجھے زندگی کی مقدس مسرتوں کا ہدیہ پیش کیا گیا تھا۔ میں نے خُدا کا شکر ادا کیا۔ کہ وہ ہی ہر قسم کی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ پھر میں نے آم کے درخت کی ایک نازک سی ڈالی توڑ کر گائے کو کھلائی۔ اس سے میری روح کو کچھ تسکین سی ہوئی۔ اور مجھے یوں معلوم ہونے لگا جیسے میں نے گائے کو نہیں۔ بلکہ اپنے خُدا کو خوش کیا ہے۔

دوسرے سال میں فروری کے مہینے اپنے گاؤں پہنچا۔ جاڑے کا موسم ابھی رخصت نہیں ہوا تھا۔ ایک صبح میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ دھوپ کمرے میں داخل ہو رہی تھی جس کی خوشگوار گرمی نے میرے دل میں خدا کے لئے جذباتِ تشکر پیدا کر رکھے تھے۔ میں لکھنے میں مصروف تھا۔ کہ میرے خدمتگار نے مجھے اطلاع دی کہ ایک جوگن ملاقات کے لئے نیچے کھڑی ہے۔ میں نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا "کہ اسے اُوپر بُلا لاؤ۔" اور از سر نو لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جوگن میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ داخل ہوتے ہی ادب سے

پہلے اس نے میرے قدموں کو چھوا اور میرے سامنے جھک گئی۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی عورت ہے جو گذشتہ سال چند لمحوں کے لئے مجھ سے ملی تھی۔

اب میں نے نگاہ بھر کر اسے دیکھا۔ اس کی عمر اس حد سے بڑھ چکی تھی جس حد پر کسی عورت کے حسن پر بحث کرنے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے وہ سرو قد تھی۔ اور اس کا جسم بہت مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کثرتِ عبادت نے اس کی کمر میں ایک ہلکا سا خم پیدا کر دیا تھا۔ اس کی حرکات میں کسی قسم کی جھجک نہ تھی۔ اس کے چہرے کا سب سے نمایاں حصہ اس کی خوبصورت آنکھیں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس شے کی طرف وہ دیکھتی ہے۔ اس شے میں اس کی نگاہیں کھُب جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی زبردست قوت ادراک تھی۔ جس کا اندازہ انسان کی قوتِ فکر نہیں کر سکتی۔

جب وہ اندر داخل ہوئی۔ تو مجھے یوں معلوم ہوا۔ جیسے اس نے اپنی ان دو خوبصورت آنکھوں سے میرے جسم کو ایک دھکا سا دیا گیا ہے۔ بالآخر وہ کہنے لگی۔

"میرے معبود! مجھے تو نے اپنے تخت کے پاس کیوں بلا لیا۔ میں تجھے درختوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ تجھ سے ملاقات کرنے یا تجھے دیکھنے کی اصل جگہ تو وہی ہے۔ میں تجھے وہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

شاید اس نے مجھے باغ میں ٹہلتے دیکھ لیا تھا۔ لیکن چونکہ گذشتہ چند دن سے مجھے نزلے کی شکایت تھی۔ اس لئے میں ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جوگن نے کہا۔ "اے میرے معبود! مجھے نیکی کی راہ بتا!"

میرے لئے یہ سوال بالکل ناگہانی اور غیر متوقع تھا۔ چنانچہ میں نے بلا تامل جواب

دیا۔ کہ نیکی کا درس نہ میں نے کبھی لیا ہے۔ اور نہ دیا ہے۔ میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں اور میرے لبوں پر مہر سکوت لگی رہتی ہے۔ اس طرح میں دیکھ بھی سکتا ہوں۔ اور سن بھی سکتا ہوں۔ خواہ کوئی آواز پیدا ہو یا نہ ہو۔ اس وقت میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ سن رہا ہوں۔"

میری بات سن کر اس کے دل میں ہیجان کی سی ایک کیفیت طاری ہو گئی اور وہ کہنے لگی۔ "خدا نہ صرف اپنی زبان بلکہ اپنے تمام جسم کے ساتھ مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے"

مَیں نے کہا۔ "میں خاموشی کی حالت میں اپنے تمام جسم سے سن سکتا ہوں اور میں صرف یہی آواز سننے نکلنے سے یہاں آیا ہوں۔"

جوگن بولی۔ "یہ بات مجھے معلوم ہے۔ اور اسی لئے تیرے حضور میں پہنچی ہوں" جانے سے پہلے اس نے پھر جھک کر میرے قدموں کو چھوا۔ اور میرے پیروں میں جرابیں دیکھ کر اسے کچھ تکلیف سی ہوئی کیونکہ وہ میرے ننگے پیروں کو چھونا چاہتی تھی۔ دوسرے دن صبح صبح ہی میں اپنے بالا خانے چھت پر آ بیٹھا۔ جنوب کی طرف درختوں کی قطاروں کے پار مجھے اجاڑ اور سرسبز وسیع میدان نظر آ رہا تھا۔ اور مشرق میں دور بہت دُور ایکھ کے کھیتوں پر سے سورج طلوع ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گھنے درختوں کے جھنڈوں میں گاؤں کی سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ جو دوسرے قصبات کی طرف جاتی تھی۔ اور دُور پہنچکر دھند میں غائب ہو جاتی تھی۔

اس صبح یہ کہنا مشکل تھا۔ کہ سورج طلوع ہو چکا ہے۔ کیونکہ ہر طرف دھند ہی دھند نظر آتی تھی۔ اور درختوں کی چوٹیوں سے ابھی تک پالا چمٹا ہوا تھا۔

صبح کے دھند لکے میں مَیں نے اپنے سامنے جوگن کو جاتے دیکھا۔ وہ خدا کی

تعریف میں گیت گاتی سنکھ بجاتی پھر رہی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ غائب ہونے لگی۔ اور سورج کی تیز روشنی ہر طرف پھیل گئی۔

مَیں اپنے حریص ایڈیٹر کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے کمرے میں بیٹھا مضمون لکھ رہا تھا کہ مجھے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک ہی لمحے کے بعد میں دیکھا کہ جوگن آہستہ آہستہ کوئی گیت گنگناتی آ رہی ہے۔ وہ میرے کمرے میں آ کر میرے سامنے ادب سے جھک کر کھڑی ہو گئی جب میں نے اپنا سر اُوپر اٹھایا۔ تو وہ کہنے لگی۔" میرے معبود! کل میں تیرے دسترخوان سے کچھ بچا کھچا کھانا بطور تبرک لے گئی تھی۔"

مَیں یہ سُنکر چونک اُٹھا۔ اور اس سے پوچھا کہ "تم نے اسے حاصل کس طرح کیا؟"

اس نے کہا کہ "میں دروازے پر بہت دیر تک منتظر رہی۔ اور جب ملازم کھانے کے برتن باہر لایا۔ تو طشتری میں سے کچھ کھانا میں لے لیا۔"

مجھے اس کا بیان سن کر بہت تعجب ہوا۔ گاؤں کے سب لوگ جانتے تھے کہ میں یورپ جا کر فرنگیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھا چکا ہوں۔ اس لئے مذہب کے پجاری میرے کھانے کو ناپاک سمجھتے تھے۔

میرے چہرے پر تعجب کے آثار دیکھ کر جوگن کہنے لگی۔" میرے معبود! اگر میں تیرا کھانا اپنے لئے ناجائز سمجھوں۔ تو بھلا پھر تیرے پاس کس لئے آؤں۔"

مَیں نے کہا۔" یہ ٹھیک ہے مگر لوگ کیا کہیں گے؟"

وہ بولی۔" مَیں پہلے ہی تمام لوگوں کو بتا چکی ہوں۔ میری باتیں سنکر وہ اظہار تاسف کر کے اپنے سر ہلا چکے ہیں۔ اور کہہ چکے ہیں۔ کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا

چاہیئے۔"

مجھے معلوم ہوا کہ یہ جوگن ایک نہایت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی خوشحال ماں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ مگر اس نے جوگن بننے کو ترجیح دی۔ اس نے مجھے بتایا کہ در در کی بھیک مانگ کر جو روزی مجھے ملتی ہے۔ میں اسی کو مقدس سمجھتی ہوں۔ میں کچھ عرصہ اس کی بات پر غور کرنے کے بعد اس کے مدعا کو فوراً سمجھ گیا۔ جب ہمیں روزی خیرات کی صورت میں ملتی ہو۔ تو ہم خدا ہی کو اپنا داتا سمجھتے ہیں۔ اور اس کے زیادہ شکر گذار رہتے ہیں۔ لیکن جب ہمیں گھر پر معمول کے مطابق کھانا ملتا رہتا ہے۔ تو اسے اپنا حق تصور کرنے لگتے ہیں۔

میری خواہش تھی کہ اس کے شوہر کے متعلق اس سے کچھ پوچھوں۔ لیکن چونکہ اس نے خود کبھی اس کا ذکر نہ کیا تھا۔ اس لئے میں نے اس سلسلے میں اس سے کوئی سوال پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جوگن کے دل میں گاؤں کے متمول لوگوں کی ذرّہ بھر بھی وقعت نہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ خدا کی راہ میں ایک پائی تک خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود خدا نے انہیں دولت اور مسرت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ان کے مقابلے میں غریب فاقہ کشی کرتا اور بھوکے مرتے ہیں۔

مَیں نے اس سے پوچھا کہ تم ان گمراہ لوگوں میں جا کر کیوں نہیں رہتیں تاکہ وہ سیدھی راہ پر چل سکیں۔ یہ بھی تو خدا کی عبادت کی ایک بہترین صورت ہے۔ لیکن جوگن کے دل پر میری اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں

سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ یعنی چونکہ خدا گنہگاروں کی سرپرستی کرتا ہے۔ اس لئے جب ہم ان کی خدمت کرتے ہیں۔ تو دراصل خدا کی خدمت انجام دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔" ہاں میری بات کا یہی مطلب ہے۔"

اس نے بے صبری سے جواب دیا۔" بیشک خدا ان کے ساتھ ہے۔ ورنہ وہ کبھی عیش و عشرت کی زندگی نہ بسر کر سکیں۔ لیکن مجھے ان سے کیا مطلب! میرا خدا ان کے ساتھ نہیں ہے۔ میں وہاں رہ کر خدا کی عبادت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میرا خدا ان میں نہیں ہے۔ میں اپنے خدا کو اس جگہ ڈھونڈتی ہوں۔ جہاں وہ موجود ہے۔"

جب اس نے مجھ سے یہ کہا۔ اس کی گردن میرے سامنے فرطِ احترام سے جھک گئی تھی۔ اس کی باتوں کا غالباً یہ مطلب تھا۔ کہ خدا کے ہر جگہ موجود ہونے کا نظریہ غلط ہے۔ اور ہمیں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جوگن مجھے ایک انسان سمجھ کر میری پرستش کرتی تھی نہیں بلکہ اس نے میرے وجود کو خدا کی عبادت کا ایک وسیلہ سمجھ رکھا تھا مجھے اس کی اس عبادت کے ردّ و قبول کا کوئی اختیار نہ تھا۔ کیونکہ وہ میری عبادت نہیں بلکہ خدا کی عبادت کرتی تھی۔

دوسری مرتبہ جب وہ آئی۔ تو اس نے پھر مجھے کتابوں اور کاغذوں کے انبار میں گھرا ہوا دیکھا۔ اور تنگ آکر بولی:" میرے معبود! یہ کیا مصیبت ہے۔ میں جب آتی ہوں۔ تجھے مطالعہ میں مصروف دیکھتی ہوں۔"

میں نے جواب دیا:" اپنی ناکارہ اور حقیر مخلوق کو ہر وقت مصروف رکھتا ہے

تاکہ وہ فتنہ و فساد برپا کرنے سے بچی رہے۔"

جوگن کہنے لگی۔"میرے معبود! تو نے میری راہ میں بہت سے کانٹے بو رکھے ہیں۔ میں ان کی تاب نہیں لا سکتی۔ اگر میں تیرے پاس آنا چاہتی ہوں۔ تو تیرے نوکر مجھے روک لیتے ہیں۔ اگر میں تیرے پاؤں چھونا چاہوں۔ تو حرامیں حائل ہوتی ہیں۔ اور جب میں تجھ سے سیدھی سادی باتیں کرنا چاہوں۔ تو تیرا دماغ مجھے لفظوں کے وسیع و عریض صحرا میں راہ گم کردہ معلوم ہوتا ہے۔"

جب وہ مجھ سے رخصت ہونے لگی تو بولی۔"میرے معبود! آج صبح جب میں نے تیرے پاؤں اپنے سینے میں محسوس کئے۔ تو اُف! وہ کس قدر سرد تھے۔ حرامیوں نے انہیں میری نظروں سے چھپا نہیں رکھا تھا۔ میں انہیں اپنے سر سے لگا کر دیر تک تیری عبادت میں مصروف رہی۔ پھر میرے آقا تو ہی بتا کہ اب میں تیرے پاس کیوں آگئی ہوں؟ میرے پھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میرے آقا! سچ سچ بتا کہ میں پھر کیوں آگئی تیرے پاس؟ کیا یہ ایک جنون نہیں؟"

اسی اثنا میں میرے گلدان کے مرجھائے ہوئے پھولوں کی جگہ تازہ پھول لگانے کے لئے جب مالی آیا۔ اور اس نے مرجھائے ہوئے پھولوں کو پھینک دینا چاہا۔ تو وہ زور سے چلا کر کہنے لگی۔"کیا اب یہ پھول بے کار ہو گئے ہیں لاؤ۔ لاؤ! انہیں میں لے لوں۔"

پھر اس نے نہایت نرمی سے ان پھولوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور نہایت احترام سے سر جھکا کر انہیں دیکھنے لگی۔

پھر اس نے اپنی نگاہ میری طرف اٹھا کر کہا تم ان پھولوں کو غور سے نہیں دیکھتے

اگر تم انہیں ذرا بھی غور سے دیکھو۔ تو یہ سب لکھنا پڑھنا بھلا بیٹھو۔"

اس نے اس گلدستے کو نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے آنچل میں باندھ لیا اور اس آنچل کو نہایت احترام کے ساتھ اپنے سر پر رکھ کر کہنے لگی "اب میں اپنے معبود کو اپنے ساتھ ساتھ لئے پھروں گی۔"

اس کی یہ روش دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے کمرے کے گلدانوں میں جو پھول پڑے رہتے ہیں ہم ان پر ایک ایسی محبت آمیز توجہ صرف نہیں کرتے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں اور بیچارے پھول اس طرح پڑے رہتے ہیں جیسے مدرسے کے وہ غریب بچے جنہیں سزا دینے کے لئے ایک قطار میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

اسی شام کو جوگن پھر میرے اوپر کے کمرے میں آئی۔ اور آکر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔

پھر کچھ سوچ کر بولی "جب میں اپنے معبود کی تعریف میں گاتی ہوئی دردر پھر رہی تھی۔ تو میں نے وہ تمام پھول لوگوں میں بانٹ دیئے۔ ہمارے گاؤں کا نمبردار میرے اس اظہار عقیدت پر ہنسنے لگا۔ اور بولا۔ تم کیوں اس کی اس قدر پرستش کرتی ہو۔ تمہارا یہ فعل بے سود اور بے کار ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ وہ بہت بدنام ہے اور لوگ ہر وقت اس پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔

میرے معبود! کیا یہ سچ ہے؟ کیا واقعی لوگ تجھ سے رکھائی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔"

ایک لمحہ کے لئے میں مبہوت رہ گیا۔ میرے لئے یہ انکشاف بالکل نیا تھا کہ

مطبع والوں کی روشنائی کے دیکھنے واقعی اتنے دور دور پہنچ سکتے ہیں؟
جوگن نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کہا کہ گائیں کا نمبردار سمجھتا تھا کہ وہ میری پرستش کے شعلے کو اپنی ایک ہی پھونک سے گُل کر دیگا۔ وہ کیا جانتے کہ یہ ایک چھوٹا سا شعلہ نہیں بلکہ بھڑکی ہوئی آگ ہے۔ میرے معبود! مجھے بتا کہ لوگ مجھے کیوں بُرا جانتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ میں اسی قابل ہوں۔ شاید میری حرص اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں نے چوری چوری لوگوں کے دل مٹھی میں لینے چاہے۔"
جوگن بولی۔ "معبود! اب تو نے دیکھ لیا کہ ان لوگوں کے دل کس قدر حقیر اور ناکارہ ہیں۔ ان میں زہر بھرا ہوا ہے۔ لیکن یہی زہر اب تجھے اس حرص سے نجات دلا دیگا۔"
میں نے جواب دیا۔ "جس شخص کے دل میں حرص ہو اُسے ہر وقت اپنے سزا پانے کا خطرہ رہتا ہے۔ اور یہ حرص خود دشمنوں کے لئے زہر فراہم کرتی ہے۔"
اس نے کہا۔ "ہمارا مہربان خالق خود ہمیں سزا دیتا ہے۔ اور زہر کے اثرات سے ہمارے کو بچائے رکھتا ہے۔ جو شخص آخر دم تک خدا کی مرضی پہ چلتا رہتا ہے۔ وہ ضرور نجات کی راہ ڈھونڈ لیتا ہے۔"

(۲)

اسی شام کو جوگن نے مجھے اپنی زندگی کی دکھ بھری داستان سنائی۔ شام کے ستارے طلوع ہو کر درختوں کی اوٹ میں غروب ہو چکے تھے لیکن وہ اپنی داستان بیان کرتی چلی گئی۔
کہنے لگی "میرا شوہر بہت سادہ مزاج ہے۔ بعض لوگ اسے سادہ لوح خیال کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جو لوگ ہر بات کو سادہ طریقے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ صحیح راہ پر ہیں

میرا شوہر اپنے کاروبار اور گھر کے انتظام میں کافی سلیقہ رکھتا تھا۔ اسکی ضروریات محدود اور خواہشات کم تھیں۔ اس لئے وہ اپنے بڑے بڑے فرائض کو نہایت اچھی طرح سے انجام دے لیتا تھا۔ دوسری باتوں میں نہ وہ دخل دیتا تھا۔ اور نہ ہی انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔

ہماری شادی کے تھوڑے ہی عرصے بعد میرے شوہر کے والدین کا انتقال ہو گیا اور ہم دونوں تنہا رہ گئے۔ میرے شوہر میں حکومت کی بجائے اطاعت کا جذبہ زیادہ تھا وہ ہمیشہ کسی دوسرے کا مطیع ہو کر رہنا چاہتا تھا اور مجھے اس بات کا اقرار کرتے ہوئے شرم محسوس کرنی چاہیئے۔ کہ وہ مجھے نہائیت احترام کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اور اپنے مقابلے میں مجھے بہت ارفع و اعلیٰ تصور کرتا تھا۔ لیکن مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اگرچہ باتیں کرنے میں مجھے اس سے زیادہ مہارت حاصل تھی۔ مگر معاملات کی تہ تک پہنچ جانا بس اسی پر ختم تھا۔

اس کے دل میں اپنے گرو ٹھاکر کے لئے بے انتہا محبت موجود تھی۔ اس کے دل میں اس کے لئے صرف خلوص ہی نہیں تھا۔ بلکہ محبت بھی تھی۔ ایسی محبت جس کی مثال دنیا پیش نہ کر سکے۔

گرو ٹھاکر عمر میں میرے شوہر سے بہت چھوٹا تھا۔ اور وہ کس قدر حسین تھا۔ یہ میں بیان ہی نہیں کر سکتی۔ میرا شوہر بچپن میں اس سے کھیلتا رہا تھا۔ اور اس کے دل و دماغ پر ہر وقت وہی مسلط رہتا تھا۔ ٹھاکر میرے شوہر کی اس سادہ دلی کو خوب جانتا تھا۔ وہ اسے خوب دق کیا کرتا۔ وہ اور اس کے ساتھی مل کر میرے شوہر کا مضحکہ اڑایا کرتے۔ لیکن وہ ان حرکتوں کی مطلق پرواہ نہ کرتا۔

جب میں پندرہ سال کی ہوئی تو خدا نے مجھے ایک بچہ دیا۔ میری عمر اتنی کم تھی کہ مجھے اس کی پرورش اور نگہداشت کرنے کے متعلق کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مجھے بچے کو پیار کرنے کی بجائے باتیں کرنے کا زیادہ شوق تھا۔ میں گھنٹوں گاؤں میں اپنی سہیلیوں کیساتھ باتیں کرتی رہتی اور اگر کبھی مجھے بچے کی خاطر گھر ٹھیرنا پڑتا تو میں سخت برہم ہو جاتی۔ آہ میرا ننھا دیوتا میرے پاس آیا۔ لیکن میں نے اس کے لئے کھلونے تیار نہ رکھے وہ ماں کی آغوش میں آیا۔ لیکن ماں نے اسے اپنی آغوش میں جگہ نہ دی۔ آخرش ہمیشہ کے لئے مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا۔ اور اب میں نے اس کی تلاش میں دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ لیکن اسے کہیں نہیں پا سکی۔

بچہ اپنے باپ کی آنکھوں کا نور تھا۔ میری بے پروائی اور عدم توجہی پر میرے شوہر کا دل دکھتا تھا۔ لیکن خدا نے اس بچارے کو بے زبان بنایا تھا۔ اس نے کبھی مجھ سے شکوہ نہ کیا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میری بے توجہی اور بے التفاتی کے باوجود بچے کو مجھ سے زیادہ محبت تھی۔ اس کی گھبرائی ہوئی آنکھوں میں یہ خوف سما گیا تھا۔ کہ کسی دن میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ کیونکہ جب میں اس کے پاس بھی ہوتی۔ وہ مجھے نہائیت اضطراب انگیز نظروں سے دیکھا کرتا۔ چونکہ میں اس کے پاس بہت کم رہتی تھی۔ اس لئے میرے پاس رہنے کی خواہش اس کے دل میں اور بھی زیادہ تھی۔ جب میں دریا پر نہانے جاتی۔ تو وہ میری طرف دیکھ کر میرے ساتھ جانے کے لئے اپنی باہیں پھیلا دیتا۔ مگر نہانے کا گھاٹ تو وہ جگہ تھی کہ جہاں مجھے اپنی سہیلیوں سے ملنا ہوتا تھا۔ میں وہاں اپنے آپ پر بچے کا بوجھ لاد کر نہیں جانا چاہتی تھی۔

اگست کی ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں نے بچے کو نوکرانی کے سپرد کیا۔ اور خود دریا

کی راہ لی۔ میرے جانے پر بچہ زار زار رونے لگا۔ جب میں گھاٹ پر پہنچی۔ تو وہاں میری کوئی سہیلی موجود نہیں تھی۔ مجھے تیرنے کی مشق گاؤں کی سب عورتوں سے زیادہ تھی۔ موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے دریا پانی سے بھرپور تھا۔ میں تیرتی ہوئی دریا کے درمیان جا پہنچی۔

یکایک مجھے کنارے پر کسی بچے کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑکر دیکھا تو میرا بچہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر سے "اماں، اماں" پکارتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا میں نے چلا کر اس سے کہا "ارے ٹھیرو۔ آگے نہ آؤ۔ میں ابھی آتی ہوں" مگر اس نے میرا کہا نہ مانا۔ بلکہ ہنستا اور مجھے پکارتا ہوا آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ فرط دہشت سے میرے پاؤں شل ہو گئے۔ میری نگاہوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ خوف وہراس کی شدت سے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آہ جب دوبارہ میری آنکھیں کھلیں۔ تو گھاٹ کی ڈھلوان سیڑھیوں پر میرے بچے کے قہقہے ہمیشہ کے لئے جذب ہو چکے تھے۔

میں کنارے پر پہنچی اور بچے کو پانی سے نکال کر اپنی گود میں لے لیا۔ وہ ہمیشہ میری گود میں آنے کے لئے میری منتیں کرتا رہتا تھا۔ اور اب میں اسے اپنی گود میں لئے ہوئے تھی۔ لیکن آہ! اب وہ میری آنکھوں سے آنکھیں ملا کر پہلے کی طرح مجھے 'ماں' نہیں کہہ سکتا تھا۔

میرا بچہ۔ میرا دیوتا میرے پاس آیا۔ مگر میں نے اس کی پروا نہ کی۔ میں ہمیشہ اپنے دیوتا کو رلاتی رہی۔ اور جب وہ مجھ سے چھین لیا گیا۔ تب مجھے اپنی بیدردی کا احساس ہوا اور میرے دل نے اس کے لئے رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ غم محسوس کرنا شروع کیا۔ جب وہ میرے پاس ہوتا تھا۔ تو میں اسے تنہا چھوڑ جاتی تھی۔ اسے اپنے ساتھ نہ لے جاتی تھی لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کی یاد ہر وقت میرے دل میں رہتی ہے۔ اور میں اسے

کبھی تنہا نہیں چھوڑتی۔

ظاہر ہے کہ اس حادثہ کا کس قدر صدمہ میرے شوہر نے محسوس کیا ہوگا۔ کاش وہ مجھے میرے اس جرم کی سزا دے دیتا۔ یہ بات ہم دونوں کے لئے بہتر ہوتی لیکن وہ ہر بڑی سے بڑی مصیبت کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کی اہلیت رکھتا تھا اس کے منہ سے میں نے کبھی کوئی درشت کلمہ نہ سنا۔

جن دنوں میں رنج و غم سے دیوانی ہو رہی تھی۔ گردھاکر بنارس سے واپس آیا۔ شروع شروع میں تو میرے شوہر اور گردھاکر کے تعلقات محض طفلانہ دوستی تک محدود تھے۔ لیکن اب اس کا علم و فضل اور روشن ضمیری دیکھ کر میرے شوہر کے دل میں اس کے لئے احترام پیدا ہوگیا۔ اور اب تو اس کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ گردھاکر سے آزادانہ بات چیت کرتے ہوئے ہچکچانے لگا۔

میرے شوہر نے گردھاکر سے درخواست کی کہ وہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کرے۔ چنانچہ گردھاکر مجھے مقدس کتابیں پڑھنے لگا۔ اگرچہ وہ ہر بات تشریح کرکے پڑھاتا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں اس کی کسی بات کا میرے دل پر اثر نہ ہوتا تھا وہ الفاظ جو اس کی زبان سے نکلتے تھے۔ میرے دل پر کوئی اثر نہ کرتے تھے۔ اور اگر میں ان الفاظ کی کچھ قدر کرتی تھی۔ تو وہ محض اس آواز کی وجہ سے جو انہیں ادا کرتی تھی خدا نے آسمانی شراب دلوں کی گہرائیوں میں چھپا رکھی ہے۔ اور ہم اسے انسانی آواز کے ذریعے پیتے ہیں۔

میرے شوہر کو گردھاکر سے جو محبت تھی۔ اس کا اثر ہمارے گھر کے ہر ذرے پر تھا۔ میرے دل میں بھی اس کے لئے عقیدت پیدا ہو چکی تھی۔ اور اب میں مطمئن تھی۔

یعنی مَیں نے اپنے خدا کو اس گروکی صورت میں دیکھ لیا۔

وہ ہر صبح ناشتہ کرنے ہمارے ہی گھر آتا۔ جونہی صبح میری آنکھ کھلتی میرے دل میں سب سے پہلے یہ خیال آتا کہ مجھے اس کے لئے ناشتہ تیار کرنا ہے۔ میں اسے خدائے قدوس کا بھیجا ہُوا ایک انعام تصور کرتی تھی۔ جب میں اس کے لئے کھانا تیار کرنے لگتی تو میرے ہاتھوں کی انگلیاں مسرت سے کانپنے لگتیں۔

جب میرے شوہر نے دیکھا کہ میرے دل میں اس کے گرو کی اس قدر عزت اور اس قدر احترام ہے۔ تو وہ پہلے سے بھی زیادہ میری قدر کرنے لگا۔ اور جب وہ یہ دیکھتا کہ گرو اس قدر اشتیاق سے مجھے الہامی کتابیں پڑھاتا ہے۔ تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اور دل میں سوچتا کہ مَیں نے اپنی نااہلی کی وجہ سے گرو کے دل میں جو جگہ حاصل نہیں کی۔ وہ میری ذہین بیوی نے حاصل کر لی ہے۔

پانچ سال کا عرصہ اسی طرح نہایت مسرت سے کٹ گیا۔ میری زندگی کے باقی دن بھی اسی طرح بسر ہو جاتے۔ لیکن میں انجان نہ تھی۔ کہ کوئی پس پردہ مجھے چرا رہا ہے۔ مَیں اس چوری سے واقف نہ ہو سکی۔ لیکن میرے دل کے خدا نے یہ چوری پکڑلی۔ پھر میری زندگی کا وہ لمحہ بھی آ گیا۔ جب کہ یکایک میری زندگی کی بساط الٹ گئی۔

برسات کی ایک صبح کو میں دریا سے نہا کر گھر کو واپس آ رہی تھی۔ میرا بھیگا ہُوا لباس میرے جسم کے ساتھ چمٹ رہا تھا۔ سڑک کے موڑ پر آم کے درختوں کے جھرمٹ میں مجھے اپنا گرو دکھائی دیا۔ وہ کندھے پر اپنا تولیہ لٹکائے ہوئے سنسکرت کا ایک شلوک گاتا ہُوا جا رہا تھا۔ مَیں گھبرا گئی۔ بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اس کا سامنا کرنے کے خیال سے میرے دل میں تیز دھڑکن پیدا کر دی۔ مَیں نے نظر بچا کر جلدی سے وہاں سے گزر جانا

چاہا۔ لیکن اس نے میرا نام لے کر مجھے بُلا لیا۔ مَیں حیا سے نگاہیں جھکا کر سمٹی سمٹائی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے نگاہ بھر کر دیکھا اور کہنے لگا۔" اُف تمہارا جسم کس قدر خوبصورت ہے۔

مجھے یوں معلوم ہُوا۔ جیسے آم کے درختوں پر طیورِ خوش الحان نغمہ سنجی کرنے لگے ہیں اور آس پاس کی جھاڑیوں میں چمکیلے پھول کھل اُٹھے ہیں۔ یکا یک مجھے کائنات ایک کیف آفریں لذب میں ڈوبی ہوئی معلوم ہونے لگی۔

مجھے یاد نہیں کہ مَیں گھر کیونکر پہنچی۔ صرف مجھے اتنا یاد ہے کہ گھر میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے میں نے عبادت کے کمرے کی راہ لی۔ لیکن کمرہ مجھے خالی خالی محسوس ہُوا۔ میری آنکھوں کو نور کی وہی چنگاریاں رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگیں جو آم کے درختوں کے جھنڈ میں لرزتی ہوئی دکھائی دی تھیں۔

اس دن جب گرو ٹھاکر ناشتہ کے لئے آیا۔ تو میرے شوہر سے میرے متعلق دریافت کیا۔ میرے شوہر نے مجھے اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ لیکن میں اسے کہیں نہ ملی۔ میرے لئے دُنیا میں ایک انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ میں نے انتہائی مایوسی میں اپنے خدا کو پکارا۔ لیکن اس نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ وہ دن میں نے کیسے گزارا۔ رات کو مجھے اپنے شوہر کے پاس جانا تھا۔ پُرسکوت اور تاریک رات میں اس کا ذہن جلا پا کر چمکنے لگتا ہے اور اندھیرے میں اس کی گفتگو سن کر اکثر میں اس کی فہم اور عقل پر حیران ہو جایا کرتی تھی۔

بعض اوقات رات کو مجھے گھر کے کام کاج سے بہت دیر میں فرصت ملتی اور میرا شوہر بستر میں لیٹنے کی بجائے میرے انتظار میں فرش پر بیٹھا رہتا۔ اس موقع پر ہماری

گفتگو کا موضوع اکثر گرد ہی ٹھا کرہوتا تھا۔

اس رات جب میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا۔ تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ میرا شوہر فرش پر دراز تھا۔ اور گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اس وقت اس کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ اور فرش پر اس کے قدموں کی طرف لیٹ گئی۔ میرے سر کا رخ میرے شوہر کے قدموں کی طرف تھا۔ ایکدفعہ اس نے سوتے میں اپنے پاؤں پھیلائے۔ تو وہ میرے سینے پر لگے۔ اور اس کا آخری تحفہ تھا۔ جو اس نے مجھے دیا۔

صبح اس کے بیدار ہونے سے پہلے میں اُٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اور میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ رات کے سیاہ دوپٹے پر شفق جگمگا رہی تھی۔

میں نے جھک کر اپنی پیشانی سے اپنے شوہر کے قدموں کو چھوا۔ اور وہ چونک کر اس طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ گویا وہ کسی خواب سے چونک کر بیدار ہوا ہے۔

جب اس نے حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ تو میں نے اس سے کہا کہ میں نے دُنیا کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آئندہ میں تمہارے پاس نہیں رہ سکتی اب مجھے تمہارے گھر کو خیرباد کہنی پڑے گی۔

میرے شوہر نے سمجھا۔ کہ وہ اب بھی خواب دیکھ رہا ہے۔ اس لئے اس نے جواب میں ایک لفظ تک نہ کہا۔

میں نے دوبارہ نہایت غمگین لہجہ میں کہا کہ " آہ، میری بات سنو اور اس کو سمجھو تمہیں اب دوسری شادی کر لینی چاہیئے۔ میرا اب یہاں سے رخصت ہو جانا ناگزیر ہے میرا شوہر کہنے لگا۔ یہ کیا پاگلوں کی سی باتیں کئے جا رہی ہو۔ تمہیں کس نے دنیا ترک کر دینے کو کہا ہے؟"

مَیں نے جواب دیا "میرے گرو دیوتا کرنے!"

میرا شوہر کچھ حواس باختہ سا ہو گیا۔ اور چلا کر بولا "گرو دیوتا کرنے کب تمہیں یہ نصیحت کی؟"

مَیں نے جواب دیا۔ "کل صبح جب میں دریا پر سے آتی ہوئی راہ میں اس سے ملی تھی"

میرے شوہر کی آواز کانپنے لگی اور وہ میرے چہرے پر اپنی دُکھ بھری نگاہیں گاڑ کر بولا "اس نے تمہیں ایسا حکم کیوں دیا؟"

مَیں نے جواب دیا "مجھے تو معلوم نہیں۔ اسی سے پوچھ لو۔ اگر اس نے بتلانے کی جرأت کی۔ تو اسی سے تمہیں سارا حال معلوم ہو جائے گا۔"

میرا شوہر کہنے لگا "لیکن دُنیا میں رہ کر بھی انسان تارک الدنیا ہو سکتا ہے۔ تمہارے لئے میرا گھر چھوڑنا ضروری نہیں۔ کل میں اس بارے میں اپنے گرو سے بات چیت کرونگا۔"

مَیں نے کہا "تمہارا گرو تمہاری درخواست منظور کرے تو کرے۔ مگر میرے دل کو بدلنا کسی کے اختیار میں نہیں۔ میرے لئے تمہارے گھر کو خیر باد کہنا ضروری ہو گیا ہے۔ اب دُنیا میرے لئے باقی نہیں رہی۔"

میرا شوہر خاموش رہا۔ اور ہم اندھیرے میں اس وقت تک فرش پر بیٹھے رہے جب تک کہ دن کی روشنی پھیل نہ گئی۔

اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ کہ "چلو دونوں گرو کے پاس چلیں"

مَیں نے جواب میں دست بستہ اس سے کہا۔ "کہ اب میں کبھی اس سے ملنا نہیں چاہتی۔"

میرے شوہر نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اور میں نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

اس کے بعد اس نے کچھ نہ کہا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے دل کے حال سے پوری طرح واقف ہو گیا ہے۔

دنیا میں صرف دو آدمیوں کو مجھ سے حقیقی محبت تھی۔ ان میں سے ایک میرا بچہ تھا۔ اور دوسرا میرا شوہر۔ یہی محبت میرا خدا تھی۔ اس لئے یہ کسی قسم کی ناراضگی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن میرے بچے نے خود مجھے چھوڑ دیا۔ اور اپنے شوہر کو خود میں نے چھوڑا۔ میرے لئے اب صداقت سے محبت کرنے کے سوا اور کیا باقی ہے "

یہ کہہ کر اس نے میرے قدموں کو چھوا اور رخصت ہو گئی۔

رہروانِ جادۂ عشق

یہ افسانہ سائنا کے ایک باشندے نے عورتوں کی ایک جماعت کو سنایا سنانے والا کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ بلکہ اس کا شمار شہر کے معتمدین میں ہوتا تھا۔

نوجوان "میری اولو" سائنا کے ایک نیک نام خاندان کا رکن تھا۔ اس کے اخلاق و آداب نہایت اچھے تھے۔ وہ شہر کے ایک بہت ہی معزز رئیس کی خوبصورت لڑکی پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا تھا۔ بڑی مدت تک اپنی محبوبہ کی طرف دیوانہ وار متوجہ رہ کر اس نے نوجوان عورت کے دل میں محبت کے جذبات متلاطم کر دیئے۔ ایسے جذبات جن کی شدت کچھ ان محبت آمیز جذبات سے کم نہ تھی۔ جو خود میری اولو کے دل میں اضطراب پیدا کر رہے تھے۔ لیکن صرف ان دونوں کی آنکھیں ہی ایک دوسرے کو ان جذبات کی قیادت کا احساس کرا سکتی تھیں۔ جوان کے دلوں پر مسلط ہو رہے تھے۔ وہ بڑے اضطراب سے کسی ایسے موقعے کا بے سود انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے اس طرح وابستہ ہو جائیں۔ کہ کوئی طاقت انہیں جُدا نہ کر سکے۔

اس نوجوان کی محبوبہ جس قدر حسین تھی۔ اتنی ہی عقلمند بھی۔ جب اس کے اعزہ واقربا نے اسے میری اولو سے شادی کرنے کی اجازت نہ دی ملو اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں خفیہ طور پر اپنے محبوب سے شادی کر لوں گی۔ کیونکہ فراق و ہجر کی دہشت آفرینیوں سے بچنے کے لئے اور وصل کی نشاط انگیزیوں سے ہمکنار رہنے کا یہی ایک طریقہ باقی تھا۔

ایک پادری کو نوجوان نے خوب ثبوت دینے کے بعد اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ چوری چوری ان دونوں کی شادی کرا دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک دن وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیئے گئے۔ لیکن ان کی محبت کا زمانہ پھولوں میں بسی ہوئی ہوا کے لطیف جھونکے کی طرح بہت جلد گذر گیا۔ ان کی "قسمت کی دیوی" کو ان کی "مسرت کی دیوی" سے عناد ہو گیا۔ میری اولو کی ایک معزز شہری سے تکرار ہو گئی۔ تو تو میں میں کے بعد ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی۔ لیکن بدقسمتی سے میری اولو نے اپنے حریف کو اس قدر مہلک زخم پہنچائے کہ اسے قانون کے چنگل سے بچنے اور اپنی جان بچانے کے لئے اس ملک سے بھاگ جانا پڑا۔

سائنا کی عدالت نے ملک کا کونہ کونہ چھان مارنے کے بعد مجرم کے لئے جلاوطنی کی سزا کا حکم سنا دیا۔ یہ وحشت ناک حکم سنکر ان نوجوانوں اور ناتجربہ کاروں کو کس قدر غم ہوا ہوگا۔ اور انہوں نے کتنے آنسو بہائے ہونگے۔ الفاظ اس کے اظہار سے قاصر ہیں۔ البتہ اس کا اندازہ ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جن کے دل محبت سے لبریز ہوں۔ اور جو زندگی کی خواب آسا اور شیریں مسرتوں سے اچانک زبردستی علیحدہ کر دیئے گئے ہوں۔ اور بالآخر ایک دوسرے کو عمر بھر کیلئے الوداع کہنے والے ہوں

ان کی جدائی کی مدت کس قدر روح فرسا اور طویل تھی۔ فرطِ غم سے وہ سسکیاں لیتے ہوئے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئے۔ انہوں نے جدا ہونا چاہا۔ لیکن ایک دوسرے کی دُکھ بھری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے دوڑ کر پھر ایک دوسرے سے گلے مِل گئے۔ جب خوبصورت لڑکی کا سر اپنے محبوب کے سینے پر جُھکا۔ وہ اپنا غم بھول گئی تھوڑی دیر کے بعد ان دونوں کے دل سے بتدریج غم زائل ہوتا چلا گیا میری اوٹو اسے وطن میں واپس آجانے کے متعلق تسلیاں دیتا رہا اگرچہ میں اٹلی سے جا رہا ہوں۔ لیکن اسکندریہ میں مجھے اپنے ماموں کے یہاں پناہ مل جائے گی۔ جو وہاں کا ایک مشہور تاجر ہے۔ مَیں تمہیں وہاں سے خط لکھتا رہونگا۔ اور ایسی تدابیر اختیار کرونگا۔ کہ ہم تھوڑا ہی عرصہ جدا رہنے کے بعد دوبارہ ایک دوسرے سے مل سکیں۔"

اسی طرح باتیں کرتے اور روتے ہوئے انہوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے کی گرفت سے اس انداز کے ساتھ چھڑایا۔ جس طرح گوشت ہڈیوں سے جدا کیا جاتا ہے

اپنے وطن کے ساحل پر آخری قدم رکھنے سے پہلے میری اوٹو نے اپنے بھائی کو پاس بلایا اور اسے تمام حالات سے باخبر کرتے ہوئے عاجزانہ درخواست کی کہ" دیکھو بھائی! میرے بعد اپنی فرقت زدہ بھائی کا خیال رکھنا اور اس کی ایک ایک بات اور اس کے ساتھ پیش آنے والے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ سے مجھے ہر آن آگاہ کرتے رہنا۔"

اس کے بعد میری اوٹو اپنے وطن کے ساحل پر پہنچا۔ اور جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

نوجوان کے ماموں نے اپنے بھانجے کا نہایت گرم جوشی اور تپاک سے خیر
مقدم کیا۔ جلاوطن مسافر نے جلد ہی اسے پیش آئے ہوئے حادثات کی تفصیل کہہ
سنائی۔ تاجر نے نوجوان کا افسانۂ غم بڑی ہمدردی سے سنا۔ اور اس کی گزشتہ
غلطیوں پر اسے بے فائدہ سرزنش کرنے کی بجائے اسے نہایت نرمی اور دانائی
سے دلاسا دیا۔ کہ تم نے جن جن خاندانوں کو اپنی حرکات سے ناراض کر لیا ہے وہ
پھر تم سے خوش ہو جائیں گے۔ اس نے صورت حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے
اپنے خطاب کو چھپانے کی بھی کوئی خاص کوشش نہ کی۔ بلکہ میری اوٹو کو تاکید
کر دی۔ کہ وہ سخت محتاط رہے۔ اس کے بعد اس نے اپنی بحری تجارت کا کچھ
کاروبار اس کے حوالے کر دیا اور مستقل طور پر اسے اپنے ہی گھر میں رکھ لیا لیکن
نوجوان کے دل میں چین کہاں۔ اندر ہی اندر محبت کا غم اسے کھا رہا تھا۔
تنہائی میں نہ جانے وہ کتنی کتنی دیر تک رویا کرتا تھا۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً اسے اپنی
تباہ حال دلہن یا بھائی کے خطوط موصول ہوتے رہتے جو اس کی زندگی کی واحد سرمائے
گیانوزہ کے باپ کو کیا خبر تھی کہ میری بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے
پاس جگہ جگہ سے بیٹی کے رشتے کے پیغام آنے لگے۔ کئی نوجوانوں کو تو روکھے
جوابوں سے ٹال دیا گیا۔ لیکن کہاں تک۔ اب غریب لڑکی کو کچھ ایسے سبز باغ
دکھلائے گئے کہ اسے ہاں کرتے ہی بنی۔ لیکن اس دکھ اور اذیت بھری زندگی کا
تصور اسے موت سے زیادہ بھیانک نظر آتا تھا۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اس
کے پیارے شوہر کی واپسی کی اب کوئی اُمید نہیں رہی۔ اور انکشاف حقیقت
دونوں کی تباہی اور رسوائی کا موجب ہوگا۔ اس کے دل میں یکایک ایک خیال

گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ خواہ اسے اپنی جان اور ناموس ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونے پڑیں۔ وہ بہر حال اپنے آپ کو اس تاریک مستقبل سے بچا لے گی۔ اس "شریفانہ عہد" سے اچھی طرح دل کو متاثر کر کے بظاہر اس نے باپ کی خوشی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

اس کے بعد اس نے پادری کو بلایا۔ جو پہلے پہل ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر کے ان کے غم کا باعث بنا تھا۔ اس نے نہایت راز داری سے اسے اپنے ارادے سے خبردار کیا۔ اور اپنے قطعی فیصلہ کو جامۂ عمل پہنانے میں اس سے مدد مانگی۔ پادری بڑی حیرت سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ کچھ تذبذب اور کچھ بزدلی کا اظہار کرنے کے بعد جب اس نے اس گرانقدر رشوت کا تصور باندھا جو لڑکی اسے اپنا ہم خیال بنانے کے سلسلے میں دینے والی تھی۔ تو اسکی کمزور روح میں طاقت آگئی۔ جب اس نے لڑکی کے جذبات انتہا پر پہنچے ہوئے دیکھے۔ تو وقت کم ہونیکے خیال سے فوراً اس نے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ایک ایسی دوا تیار کرنے کی حامی بھر لی۔ جو اگر پانی میں ملا کر کسی کو پلا دی جائے تو اس پر متواتر تین دن تک ایسی غفلت طاری رہے کہ دیکھنے والے اسے مردہ سمجھ لیں۔

چنانچہ اس نے فوراً یہ دوا تیار کر کے شوہر کی باوفا اور اسیر محبت بیوی کو بھیجدی۔ جب اسے دوا کا پارسل ملا۔ تو وہ ایک جگہ بیٹھ کر میری اولو کو اپنے ارادوں کا مفصل حال خط میں لکھ رہی تھی۔ کہ کس طرح مستقبل سے ڈر کر اور اپنے محبوب سے ملنے کیخاطر وہ پادری سے ساز باز کر کے عنقریب اس کے پاس آنیوالی ہے۔

خط لکھنے کے بعد اس نے نہایت خوشی سے دوا کا پیالہ اٹھا کر پی لیا۔ اس پر

ایک گہری بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ اور وہ نیم بیہوشی کی حالت میں اپنے پلنگ پر اس انداز سے گر گئی۔ جیسے اس کی رُوح پرواز کر گئی ہو۔

جب اس کی سہیلیاں اس کمرے میں آئیں تو اپنی خوبصورت سہیلی کو بے ہوش دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں۔ انہوں نے جلد ہی اس خوفناک حادثے کی اطلاع گھر کے دوسرے افراد تک پہنچائی۔ دلہن کا باپ چند مہمانوں کے آگے آگے بھاگتا ہوا اسکے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی نوجوان اکلوتی بیٹی اس کی آنکھوں کے سامنے بے جان پڑی ہے۔ ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ لیکن بے سود۔ اسے ہوش میں لانے کی ناکام کوششوں کے بعد تمام لوگوں نے یہ متفقہ فیصلہ کر لیا۔ کہ یکایک اس پر تشنج کا دورہ پڑا ہے۔ اور یہی اس کے انتقال کا باعث ہوا ہے۔

تمام دن اور تمام رات وہ اسی طرح پڑی رہی۔ اس کے جسم کو جنبش تک نہ ہوئی۔ اس کے والدین اور اعزہ و اقربا کا مارے غم کے بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس کے ماتم کرنے والوں، دوستوں اور عزیزوں کی تعداد بہت بڑی تھی۔ اسکی تجہیز و تکفین کی رسوم نہایت شاندار طریقے سے ادا کی گئیں۔ اور اسے سینٹ آگسٹائن کے ایک بہت بڑے گنبد میں دفن کر دیا گیا۔ نصف شب کے قریب جب تعظیم پادری اسے قبر سے نکال کر اپنے کمرے میں لے گیا جب اس دوا کے زبردست اثر کے زائل ہونے کا وقت آیا تو پادری نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک دوسری دوا پلائی۔ اور وہ اس طرح اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جیسے کوئی خواب سے بیدار ہوتا ہے۔ بمشکل تین دن کے بعد وہ اپنے مجوزہ سفر پر روانہ ہو سکی۔ اس سے ملنے کے لئے جس کی خاطر اس نے اس قدر تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ ایک راہب کا بھیس بدل کر وہ بندرگاہ پیسا تک پہنچی جہاں سے کچھ جہاز

اسکندریہ روانہ ہونے والے تھے۔ وہ ایک جہاز پر سوار ہو گئی لیکن مخالف ہواؤں اور دوسرے مصائب کے باعث جہاز بہت پیچھے چلے گئے۔ اور انہیں بندرگاہ از سرِنو تلاش کرنے اور جہاز کی مرمت کرنے میں کئی ماہ سمندر میں ہی لگ گئے۔

میری اوڈو کے بھائی گارگانو نے اس عرصے میں اپنے وعدے کے مطابق اپنے بھائی کو بھائی کی موت کے متعلق ایک ایک بات لکھ دی۔ بلکہ اس نے اپنے خط میں اس کی موت کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات نہایت تفصیل سے دُہرا دی۔ اور بتایا کہ کس طرح تھوڑے ہی دنوں بعد لڑکی کے غم میں اس کے بوڑھے باپ کا بھی انتقال ہو گیا

بدقسمتی سے یہ خطوط گیانو نا کے ان خطوط سے پہلے موصول ہو گئے جن میں اس نے اپنے محبوب کو اپنے خفیہ ارادوں سے آگاہ کیا تھا۔ قسمت کی دیوی کبھی جنہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔ اب اس نے ان سے اپنی نگاہِ التفات ہٹا لیں۔ چنانچہ دلہن کی آمد کی خوشخبری کے متعلق تمام خطوط بحری ڈاکوؤں کی نذر ہو گئے۔ اور گارگانو کے خطوط منزلِ مقصود تک پہنچ گئے جنہیں پڑھ کر نوجوان عاشق کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کا ملول سے تسلی دیتے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ خود اس نے بھی اس کے غم کو دل سے بھلا دینے کی پوری کوشش کی۔ آخر اس نے اپنی محبوبہ کیا دلہن کی قبر تک جا کر اس کی یاد میں اس وقت تک آنسو بہاتے رہنے کا فیصلہ کر لیا جب تک نا امیدی یا وہ آئین جن کی اس نے خلاف ورزی کی تھی۔ اس کے بُرے دنوں کا خاتمہ نہ کر دیں۔ صرف اس طریقہ سے اپنی دلہن کی ملاقات پر وہ اپنے آپ پر فخر کر سکتا تھا۔ دُنیا میں اگر کسی سے اس نے عشق کیا تھا۔ تو صرف اس لڑکی سے جس نے اسے اپنا کہنے کے لئے اپنی تمام شریفانہ امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

یہ فیصلہ کرکے وہ وینس کے ان جہازوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جو مغرب کی سمت روانہ ہونے والے تھے۔ اپنے رشتہ داروں کو کوئی اطلاع دیئے بغیر اس نے جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ نیپلز کی طرف مختصر سفر کرنے کے بعد وہ بلا خوف یا یوں کہیئے کہ موت کی امیدیں دل میں لیئے ہوئے تسکان پہنچا۔ وہاں سے ایک زائر کا بھیس بدل کر سیانا میں وارد ہوا۔ یہاں اس نے اپنے کسی دوست کو اپنی آمد کی اطلاع نہ دی تھوڑی سی تلاش سے اُسے وہ جگہ مل گئی۔ جہاں اس کے خیال میں اس کی محبوبہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ قبر پر دیر تک زار و قطار روتے رہنے کے بعد وہ ہستی کے پہلو میں ابدی نیند سو جانا چاہتا تھا۔ جس کے نزدیک سونے کی زندگی بھر میں اسے کبھی جسارت نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ ہمیشہ اس کی باوفا محبوبہ رہی تھی۔

آخر ایک دن وہ شام کے قریب گرجے میں چھپ گیا۔ جہاں اس نے اس مقصد کے لئے کہیں سے چند اوزار کھدائی کرنے کے لئے چھپا رکھے تھے۔ اور رات کو اس نے اپنی محبوبہ کی قبر کھودنی شروع کر دی۔

جب قبر کھود دی جا چکی اور وہ اس میں بیٹھنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ تو محافظ نے جو صبح کی پھیری لگانے یہاں آ رہا تھا۔ اس گڑبڑ کی آواز سن لی۔ اور وہ فوراً اس جگہ آ پہنچا۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک آدمی قبر کھود کر اس میں داخل ہو رہا ہے تو اس نے ڈر کر شور مچا دیا۔ فوراً کئی پادری اور چند دوسرے آدمی نیم برہنہ لباس میں دوڑتے ہوئے وہاں آ پہنچے۔ جب انہوں نے دروازہ کھولا۔ تو تباہ حال نوجوان کو گنبد کے نیچے پایا۔ جلد ہی لوگوں نے پہچان لیا کہ وہ میری اوڑ ہے۔ اس کی آمد کی خبر آناً فاناً آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ اور جب یہ خبر قانون کے

ارباب اقتدار کے کانوں تک پہنچی۔ تو فوراً احکام نافذ کر دیئے گئے۔ کہ مجرم کو قبر کھودنے کے جرم کی سزا دی جائے۔ چنانچہ اس غریب کو قید کر کے پرولیسٹا کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور حکم دیا گیا کہ اقبال جرم کرنے کے لئے مجرم پر زیادہ سے زیادہ سختی کی جائے۔

بدنصیب نوجوان نے اپنی غم انگیز یوں کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ اس کا یہ بیان سُنکر کہ اس نے آخر دم تک کس وفاداری اور محبّت کا ثبوت دیا ہے۔ حاضرین عدالت کے دل پسیج گئے۔ عورتیں تو خاص طور پر اس کی محبّت کا غمناک فسانہ سُنکر متاثر ہوئیں۔ کئی آدمیوں کو اس سے یہاں تک ہمدردی ہو گئی۔ کہ اُنہوں نے عدالت میں اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ کہ مجرم کی بجائے عدالت ہمیں سزا دے سکتی ہے۔ لیکن قانون نے کسی ایک کی نہ سُنی۔ اور عدالت نے اسے سزائے موت کا حکم دیا۔ اس کے اعزہ و اقربا کی تمام سفارشیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اور قانون کے دیوتاؤں نے نوجوان کو پابجولاں قتل گاہ کی طرف بھیج دیا۔

اس عرصے میں اس کی غم زدہ دلہن بڑی دوڑ دھوپ اور تکلیفیں جھیلنے کے بعد اسکندریہ پہنچی۔ اور فوراً اس نے اپنے پیارے شوہر کے ماموں کے گھر کی راہ لی۔ جسے اس نے اپنی مصیبت کے تمام واقعات سُنا دیئے۔ وہ اس سے نہایت دردمندی اور خلوص سے پیش آیا۔ لیکن اپنے محبوب سے ہم آغوش ہونے کی بجائے جس کے لئے اس نے اس قدر مصائب جھیلے تھے۔ جب اس نے یہ خبر سُنی کہ وہ اس کی موت کی جھوٹی خبر سُنکر پہلے سے یہاں سے روانہ ہو

چکا ہے۔ اور اس کے متعلق اس وقت سے لے کر اب تک کوئی خبر نہیں کی۔ تو وہ حواس باختہ ہو گئی۔ اس نے کس قدر محنت و مشقت اور غم سہا تھا۔ لیکن آہ یہ خبر تو بہت ہی غم افزا تھی!

بہر حال ایک دفعہ اس نے پھر کمر ہمت باندھی اور سوچ بچار میں وقت ضائع کرنے کی بجائے فوراً اس نے میری اوڈو کے ماموں کے ہمراہ سائنا پہنچنے کی ٹھان لی۔ اب صرف ایک ہی امید اس کے دل کا سہارا تھی۔ اپنے محبوب شوہر سے دوبارہ ملنے کا خیال۔

جوگن کا لباس پہنے ہوئے پھر ایک مرتبہ اپنے ہمراہیوں سمیت یہ "باوفا بیوہ دلہن" طوفان زدہ سمندروں کے سفر پر رواند ہو گئی۔ موافق ہواؤں نے اسے بہت جلد تشکان کے ساحلوں تک پہنچا دیا۔ پیابنیو کے مقام پر یہ لوگ جہاز سے اُترے اور انہوں نے سرنکم نوتاجر کے مکان کی راہ لی۔ یہ جگہ سائنا سے کچھ دُور نہ تھی۔ ان لوگوں کے عاجلانہ استفسار کا پہلا جواب یہ دیا گیا۔ کہ ان کی آمد سے تین دن پہلے میری اوڈو کو قتل کیا جا چکا ہے۔

اگرچہ انہیں میری اوڈو کے متعلق بے حد تشویش ہو رہی تھی۔ تاہم انہیں امید نہ تھی کہ اس کے انجام کے متعلق ایسی افسوسناک تصدیق بھی ہو سکتی ہے اب ان دونوں کو اس بات کی تاب نہ رہی کہ ایک دوسرے کو تسلی دے سکیں۔ دل شکستہ دلہن کی گہری اور مسلسل ہچکیاں پتھر کا دل موم کر دینے کو کافی تھیں۔ اس کے مستقبل کے متعلق کچھ سوچنا اب ضروری ہو گیا۔ ہر امکانی تسلی دینے کے بعد رحمدل تاجر نے اپنے دوستوں کے مشورے اور خود اس کی آفت رسیدہ بیوہ کے ایما

سے اسے ایک راہبہ خانہ میں پہنچا دیا۔

وہاں اس کے عالی مرتبہ کے مطابق اس سے انتہائی مہربانی کا سلوک کیا گیا۔ لیکن وہ غم کے سمندر میں کچھ اس طرح غرق ہو گئی تھی۔ کہ اس نے اپنا جھکا ہوا سر کبھی اوپر نہ اٹھایا۔ اپنے نقصان اور بدقسمتی پر پیہم آنسو بہاتی رہی۔ وہاں کی معمر ترین راہبہ جو اس کی زندگی کا افسوسناک واقعہ سن چکی تھی۔ اسے بڑی محبت سے تسلیاں دیتی رہی۔ لیکن اس نے ایک المناک چپ سادھ لی تھی آہستہ آہستہ اسے غم کھا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ بڑے رحم سے اپنے پیارے خاوند کا نام لے لے کر پکارنے لگتی۔ کچھ زیادہ عرصہ گذرنے نہ پایا تھا۔ کہ اس کی روح اس کے جسم کو چھوڑ کر میری اوڈ کی تلاش میں آسمان کی سمت پرواز کی۔

فریب در فریب

گریسی گڈنائٹ کی زلفیں مشرقی ایلڈرگیٹ ہیپ کی تمام لڑکیوں کے بالوں سے زیادہ دلآویز اور خوش نما تھیں ——— موسم خزاں کے دم توڑتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طرح جو فضا میں زرفشاں خاموش نغموں کی بارش کرتی ہیں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ کانگ فوا جیسی موٹی عقل کا جیمہ آدمی بھی اسے نوکر رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ گریسی گڈنائٹ کے متعلق طرح طرح کے شیریں تصورات اس کی رگ رگ میں حسرت کی لہر دوڑا دیا کرتے تھے۔ گریسی گڈنائٹ کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ کانگ فوا کا مکان صاف رکھے۔ اور اس کی عطر بیز دکان پر مہمانوں کی خاطر مدارت کیا کرے۔

کانگ فوا کے متعلق یہ روایت مشہور تھی۔ کہ اسے دکان داری کے چند گر ضرور آتے ہیں۔ معتبر لوگوں کا بیان تھا۔ کہ جب اس نے پینی فیلڈ میں یہ چھوٹی سی دکان کرائے پر لی۔ تو کاروبار کا بڑا مندہ تھا۔ لیکن اب؟ اب

تو اٹھارہ ماہ کے اندر اندر اس کی قسمت کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔ مختلف بنکوں میں اس کا روپیہ جمع تھا۔ اگرچہ وہ کسی کو بتاتا نہ تھا کہ میں نے کس کس بنک میں روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ جہاں اس کے ہم پیشہ دوسرے لوگوں کو اصل رقم پہ دُگنا فائدہ ہوتا تھا۔ اسے تین گنا چار گنا ہو جاتا تھا۔

جب وُہ پیسے گننے کے کٹہرے کے پیچھے اور ننھے سے جبین سر۔ اور سبک انداز، گوری گوری انگلیوں والی چست و چالاک لڑکی کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہونٹوں پہ ایک ہلکا سا تبسم لئے پہلے اس پہ اور پھر اپنے گاہکوں پہ نگاہ ڈالتا تو معاً وہ اپنے جواہرات سے لدے ہوئے ہاتھ اپنی توند پر رکھ لیتا۔

اس کی وسیع دکان میں جس کے کئی کمرے تھے۔ ہر چیز موجود تھی۔ ہر بہتر سے بہتر اور نئی چیز مثلاً انڈوں کا اچار۔ شارک مچھلی کے سوکھے ہوئے پَر، بیس سال کے پرانے کھٹے نرلوز کا رس۔ خشک انجیریں۔ لیچی۔ سوکھی ہوئی مچھلیاں میٹھے کیک، چانڈو اور اس کے استعمال کا سامان۔ چھالیہ، تیز دھار والے چمکدار چاقو۔ کاپیاں۔ پنسلیں وغیرہ۔

دیواروں پر چینی مناظر کی تصویریں۔ بطخوں کا خشک گوشت، مچھلیاں کچھ برتن اور آگ بجھانے والی گیس کی مخروطی آہنی بوتلیں آویزاں تھیں۔ بوتلوں پر ان کے استعمال کا طریقہ درج تھا۔ کانگ فوا کی حالت اتنی اچھی ہو گئی تھی کہ اس نے ایک مشہور بیمہ کمپنی سے اپنی عظیم الشان کا بیمہ بھی کرا لیا تھا۔

گر لیبی گڈ نائٹ کی وجہ سے کانگ فوا کی دکان کی شہرت روز بروز بڑھ

رہی تھی۔ اور کاروبار اپنا ترقی کر گیا تھا۔ کہ اس کی دکان پر نت نئی اور انوکھی چیزیں موجود رہتی تھیں۔

پیلی، سفید اور کالی چمڑیوں والے ہر رنگ اور ہر نسل کے نوجوان دکان پر آتے اور سگریٹ جو انہیں درکار نہیں ہوتے تھے۔ اور سوکھا ہوا پھل جو وہ نہیں کھا سکتے تھے۔ خرید لے جاتے۔ گریسی ان سے کہتی۔ "پھر بھی کبھی آؤ گے؟ اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لانا۔" وہ آتے اور پچھلے کمرے میں بیٹھ کر جس کے دروازوں پر چقیں لگی ہوتیں۔ چائے کی ایک پیالی پی جاتے۔ گریسی گڈ نائٹ خود ہی ان کے لئے چلئے لاتی۔ اور شام کو ان کے پاس بیٹھ کر کچھ باتیں بھی کرتی۔ اس کی چنچل اور بے ساختہ ادائیں انہیں کئی بار وہاں آنے پر مجبور کر دیتیں۔ اسی طرح گاہکوں میں بے اندازہ اضافہ ہوتا گیا۔ اور بنک میں کانگ فو کے روپے کی میزان بھی بڑھتی گئی۔

خوشحال ہوتے ہی وہ خوب موٹا ہو گیا۔ اور موٹا ہوتے ہی وہ زیادہ مغرور اور متکبر بھی ہو گیا۔ اس نے کاروبار میں زیادہ سے زیادہ دخل دینا شروع کر دیا بعض اوقات وہ غصے میں آپے سے باہر ہو جاتا۔ تمام قصبے میں کوئی ایسا باہمت نوجوان نہ تھا۔ جو اسے اس وقت کرسی پر بٹھا دینے کی جرأت کر سکے۔ جب وہ غصے میں آ کر جوش غضب سے کانپ رہا ہوں۔ لوگ اس سے نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ان سے بہت امیر تھا۔ بہت ہی امیر۔

کانگ فو کا خیال تھا کہ کاروبار میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ وہ اپنے حریف زمیندار کو بھول گیا تھا۔ جو شراب خانے کا مالک

تھا......

دراصل کہانی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ کانگ فوا متواتر ایک شراب خانے میں آنے جانے لگا۔ وُہ یہاں آ کر دو قسم کی شراب اپنے گلاس میں انڈیلتا۔ اور مزے سے پیا کرتا۔ یہی زمیندار اسے شراب پلایا کرتا تھا۔ ایک دن کانگ فوا اس سے کہہ بیٹھا۔ "ارے بکرے! مجھے کچھ اور شراب دے!"

زمیندار زور سے میز پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔" دیکھو مجھے اس بات پر اعتراض نہیں کہ تم میرے شراب خانے میں شراب پینے کیوں آتے ہو۔ مجھے اعتراض ہے تو اس بات پر کہ تم دوسروں کے شراب خانوں سے مخمور ہو کر یہاں آ جاتے ہو۔ اور واہی تباہی بکنے لگتے ہو۔"

کانگ فوا نے جب ذرا اسے آنکھیں دکھائیں۔ تو وہ کہنے لگا۔ چپ رہ بڈھے مرغے! راستہ صاف کر۔ گھر کی راہ لے۔" اس کے بعد اس نے اسے زبردستی دھکے دیکر باہر نکال دیا۔

جب وُہ خشم آلود ہو کر دکان پر پہنچا۔ تو گرلیسی کچھ خشک کیک ہاتھ میں لئے آ رہی تھی۔ وُہ گرج کر بولا۔" نکل جا یہاں سے!" یہ کہہ کر اس کا منہ دھونکنی کی طرح پھول گیا۔ گرلیسی حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کانگ فوا نے زور سے اس کے شانوں اپنے دونوں سے پکڑ لیا۔ اس کی گردن میں ناخن چبھو دیئے۔ اس کے خوب صورت بال نوچ لئے۔ اور اسے دھکیل کر ان سیڑھیوں پر سے نیچے گرا دیا۔ جو بازار میں اترتی تھیں۔ اس کے

لیکن اس نے گرلسی کی ہیٹ اور جاکٹ اس کے پیچھے زمین پر دے ماری۔ اور کہنے لگا۔ "نکل جا چھوکری! ڈاکو کی ماں! کتے کی بچی! چلی جا یہاں سے ...... چلی جا! ...... دور ہو جا۔"

گرلسی کے دل میں اسی دم ایک زبردست آتش انتقام بھڑک اٹھی اس کے سینے پر گویا سانپ سے لوٹنے لگے۔ اسے اس کی اس حرکت سے بے حد صدمہ پہنچا تھا۔ اسے اپنے آپ سے بے حد محبت تھی اور پھر کیوں نہ ہوتی۔ اسے اپنا نازک جسم اور پیارے پیارے بال بہت عزیز تھے۔ وہ انہیں مقدس نعمتیں سمجھتی تھی۔ وہ کیوں کسی کو اتنی آسانی سے ان پر دست درازی کرنے دیتی۔ وہ کیوں انہیں ایک بدصورت اور زرد رو آدمی کے میلے کچیلے ہاتھ لگنے دیتی۔ سب سے زیادہ غصہ اسے اس بات پر آرہا تھا۔ کہ کانگ فو نے اسے چھو کیا تھا۔

پنی فیلڈ کے تمام چینی اور سفید فام لوگ جھگڑا دیکھنے آ جمع ہوئے اور کھکھلا کر ہنسنے اور مذاق اڑانے لگے اور بہتوں نے دیکھ لیا کہ گرلسی کو بری طرح دکان سے نکال دیا گیا ہے۔ جو لوگ ذرا دیر سے پہنچے۔ انہوں نے کم از کم گرلسی کو چھوٹا سا پوکھر کا ہیٹ اور جاکٹ اٹھا کر ضرور پہنتے دیکھ لیا۔

گرلسی کے لئے یہی بات کچھ کم ہتک آمیز تھی؟ اس نے بھی ان تمام لوگوں کے سامنے اپنے مالک کو خوب کوسا۔ سخت سے سخت باتیں کہیں۔ اور پھر سڑک پر سے کیچڑ کی ایک مٹھی بھر کر دکان پر زور سے دے ماری۔ کیچڑ کھڑکی پر گرا۔ اور تمام کھڑکی خراب ہو گئی۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چلی آئی۔

تماشائیوں میں سے کسی نے اس کی مدد نہ کی۔ بلکہ اس سے ہمدردی کے دو ایک لفظ بھی کہے۔ وہ یا تو ایک دوسرے کو یہ پُرلطف واقعہ سنانے میں مصروف تھے یا سُن رہے تھے۔ وہ حسین تو تھی ہی۔ اور حسین لڑکی یا عورت کی اتنی بے عزتی ہو جائے۔ تو وہ طعنہ زنی اور مضحکوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ نظروں سے گر جاتی ہے۔ اسے ایک بزدل عورت سمجھا جاتا ہے۔

اس کی چنچل باتوں اور مسکراہٹوں کے نظارے کے لئے ہی لوگ اس دکان پر کھینچے آیا کرتے تھے۔ لیکن اس توہین آمیز مصیبت کے وقت اس کا حسن و جمال بھی اس کے کام نہ آسکا۔ وہ اس کے گرد کھڑے اس پر ہنس رہے تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر انگلیاں اٹھاتے تھے۔ اس چیختی چلاتی ہوئی رحم انگیز عورت کی طرف دیکھ دیکھ کر جس کے سر کے منتشر بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اور جس کے نازک لباس پر شکنیں پڑ چکی تھیں اور جس کا غصہ رائیگاں جا رہا تھا۔ لطف اندوز ہو رہے تھے۔

گرلیسی نے کانگ فو کی سمت ہوا میں زور سے ایک لات ماری۔ گویا اس نے اسے حقارت سے پاؤں کی ٹھوکر لگائی ہے اور چلا اٹھی۔ خدا کی قسم میں اس کا بدلہ لوں گی۔"

گرلیسی دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔" میں اس زرد کتے کو بتا دوں گی۔ کہ سفید فام یورپین لڑکیوں کی اس طرح ہتک کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ میں اسے بتا دوں گی۔ کہ گندے گندے ہاتھ، گوری گوری گردن پر کس طرح ڈالے جاتے ہیں۔ اور گرلیسی گڈ نائٹ کے بال نوچنے کا کس قدر خوفناک انجام ہوتا ہے۔

ہیں اسے بتادونگی کہ ایک فیشن ایبل لڑکی کی توہین کرنے کا کیا خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے۔ بلا سوچے سمجھے کسی کو اس طرح برطرف کردینا کہاں کی انسانیت ہے۔ نوٹس بھی نہ دیا۔ اور نکالا بھی تو کس برے طریق سے۔ دھکے دے کر سیڑھیوں سے گرا دیا۔ اور میری چیزیں گندے پانی میں گرا دیں۔"

گرلسی کو اس رات بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ اپنے سفید سفید تکیئے پر سر رکھے۔ گھنٹوں لیٹی رہی اور دیر تک خیالات میں غرق رہی۔

کچھ دوستوں سے مل کر مشورہ کرنے کے بعد طے پایا کہ "غرور بے شک اچھی چیز ہے لیکن زندہ رہنے کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیئے۔" لہذا اس نے پھر موسٹے کانگ فوا کے پاس چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔

گرلسی گڈ نائٹ کے دو ہی دن غائب رہنے سے دکان کی بکری بہت ہی کم ہو گئی تھی۔ چائے پینے کے کمرے میں تو اب بہت کم آدمی آتے تھے۔ ایک پیسہ کی بکری نہ ہوتی تھی۔

گرلسی دل میں کہنے لگی "اس کا غصہ ضرور فرو ہو چکا ہوگا۔ وہ میرے واپس آنے کو غنیمت سمجھے گا۔ میں اسی رات جاؤں گی۔ خواہ قصبے کے تمام لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس سے معافی مانگ لی ہے۔"

چنانچہ اسی رات وہ کانگ فوا کے پاس گئی۔ دریا کی سمت سے پیٹی فیلڈ کی طرف تیز ہوا چل رہی تھی۔ درختوں میں بجلی کے قمقمے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ دکان کی دیواروں پر ٹنگی ہوئی چیزیں۔ سویٹر۔ پیٹی کوٹ اور کیلینڈر ہوا میں اڑ رہے تھے۔ نرم نرم اور نازک نازک زرد زرد لڑ کے

باہر کھڑے تھے۔ گرلسی اپنی سہیلیوں اور ایک دوست کے ہمراہ یہاں آئی تھی جنہوں نے ہوا کی تند ی کے باعث اپنی ٹوپیاں اتار رکھی تھیں۔ گرلسی انہیں اس لئے اپنے ساتھ لائی تھی۔ کہ ممکن ہے۔ کاتگ فوآ پھر اس پر حملہ کر دے۔

چنانچہ وہی ہُوا جس کی اُمید تھی۔ کاتگ فوا اس وقت بھی بہت غصے کی حالت میں تھا۔ اس کی نظریں اس کمرے پر تھیں۔ جواب بالکل خالی پڑا تھا۔ اور جہاں اب کوئی لڑکا چائے پیتا نظر نہ آتا تھا۔ قہقہوں کی آوازیں مفقود تھیں۔ کمرے میں اُلّو بول رہے تھے۔ ایک بھی گاہک نہ آیا تھا۔ وہ پیسے گننے کے لئے کٹہرے کے قریب بیٹھا تھا۔ کٹہرے پر ایک بہت بڑا لیمپ روشن تھا اور دکان کے دوسرے حصے میں دو لالٹینیں جل رہی تھیں۔ ہوا۔ زور شور سے چل رہی تھی۔ بالکل خواب کا سا منظر معلوم ہو رہا تھا۔

گرلسی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ اس کے ساتھ جو دو لڑکیاں اس کی مدد کے لئے آئی تھیں۔ باہر کھڑی رہیں۔ انہوں نے گرلسی کو اندر جاتے اور اپنے مالک سے مخاطب ہوتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور غصے سے اپنا سر ہلا رہا ہے۔ گرلسی اپنی بات پہ اصرار کیے رہی تھی۔ اور کٹہرے کے اس طرف کھڑی تھی۔ سوال و جواب ہوتے رہے اور بات بڑھتے بڑھتے پھر بڑھ گئی۔ بڈھا شرابی پھر مشتعل ہو گیا۔ طور بے طور نظر آنے لگے۔ گرلسی نے جھک کر اسے کوئی بات کہی۔ کاتگ فوآ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے بھی جواب میں کوئی بات کہہ دی۔

گرلیسی نے وہی بات اُسے کہہ دی۔ کانگ فوآ کا بڑا سا آہنی بازو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔ گرلیسی خوفزدہ ہرنی کی طرح اُچک کر پیچھے آ رہی۔ ساتھ ہی اس کے کوٹ کا سمور دار بازو لیمپ سے الجھ گیا۔ شیشے کا لیمپ۔ فرش پر آ گرا اور گرتے ہی چکنا چور ہو گیا۔ آتش زدہ تیل فرش پر پھیلنے لگا کچھ کٹہرے پر بھی گر گیا جس کے ساتھ ہی خشک کھالیں پڑی تھیں۔ چند ہی سیکنڈ میں آگ کٹہرے اور کھڑکی کو جا لگی۔ ہوا تو روں پر تھی۔ آن کی آن میں آگ پھیل گئی۔ گرلیسی چیخیں مارنے لگی۔ دیو لوڑھا آدمی گرسینے لگا۔ اب دونوں چلا رہے تھے۔ پیچھے کودنے میں گرلیسی کی ٹوپی لالٹین سے جا ٹکرائی ——— لالٹین بھڑک اٹھی اور کہیں کاغذوں کے اس ڈھیر پر جا گری جو کٹہرے کے پیچھے موجود تھا۔ قریب ہی موم بتیوں کے بنڈل اور تیل کی ٹینکی موجود تھی۔

پڑوس کے دکانداروں نے جب لوگوں کی چیخیں سنیں تو دوڑتے آئے لیکن آتے ہی لوٹ گئے اور جا کر اپنی دکانیں خالی کرنی شروع کر دیں۔ کیونکہ آگ اس قدر بھڑک اٹھی تھی۔ کہ تیز و تند ہوا میں اس کے بہت پھیل جانے کا خطرہ تھا۔ سڑک پر پیلے چمڑے والے چینی لڑکے بھی آ جمع ہوئے۔ انہوں نے یہ تماشا دیکھ کر ناچنا کودنا شروع کر دیا۔

گرلیسی اپنے خوبصورت سر پر ہاتھ رکھے چلا رہی تھی۔ لوگ آگ بجھانے کی تدبیروں میں مصروف تھے۔ کانگ فوا باہر آ نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ باہر آنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ لمبے شعلوں کی زبانیں چاٹ رہی تھیں، دھواں

اس قدر تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بلند کٹہرے سے پھلانگ کر ادھر آنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ اب شاید تیل کی ٹینکی کو بھی آگ لگ چکی تھی۔ گرلیسی کانپ رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ شاید اسے آگ کی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ کاتگ فوا کو اس کے گورے گورے نازک ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ اور جب وہ آگ کی دیوار سے پرے اچھل کود رہا تھا۔ اس کے گلے سے گیدڑوں کی سی چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ وہ لوگوں کو کٹہرے سے پرے کیوں ہٹا رہی ہے۔ قریب کے مکانوں سے فرنیچر اور دیگر سامان نکالا جا رہا تھا۔ کھڑکیوں سے چٹائیاں اور قالین نیچے پھینکے جا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد آگ بجھانے کا انجن بھی آ موجود ہوا۔

کاتگ فوا اب زمین پر پاؤں مار مار کر چلا رہا تھا۔ "ارے بچاؤ! بچاؤ! بچاؤ! مجھے بچاؤ.......... جو مجھے بچائے گا۔ اسے میں بہت سا روپیہ دوں گا.......... سو پونڈ دے دونگا.......... دو سو پونڈ دے دوں گا.......... ارے کوئی بچائے..... خدا کے لئے بچائے ..... اُف..... اُف..... اُف..... اُف

اب گرلیسی پیچھے سے چلتے چلتے کمرے میں چلی گئی۔ اور کاتگ فوا کو پکار کر کہنے لگی۔ "میرے آقا کھڑے رہیئے۔ میں آپ کو بچاؤنگی۔"

اس کے بعد وہ ہجوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "آگے سے ہٹ جاؤ ادھر مت آؤ۔ اسے بچانے کا طریقہ میری سمجھ میں آگیا ہے۔ تم ذرا اس آئینے کی طرف دیکھتے رہو۔"

وہ سیڑھی لگا کر چائے پینے والے کمرے کی دیوار کے روشندان تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد ایک نازک سے ہاتھ نے پل بھر میں روشندان کا شیشہ توڑ ڈالا۔ آگ بجھانے والی گیس کی آہنی بوتل اٹھائی۔ جو اس جگہ بیمہ کمپنی نے نصب کی تھی۔ اور کانگ فوا کا نشانہ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

کانگ فوا نے جب دیکھا کہ وہ گیس سے آگ بجھانے لگی ہے۔ تو وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگا۔ "ارے پانی لاؤ۔ پانی لاؤ۔ بوتلیں پھینک دو۔ پانی لاؤ پانی!"

شاید اس سینہ زور لڑکی نے جوش اور جرأت میں کانگ فوا کی چیخ پکار نہ سنی یا نہ سننی چاہی۔ ممکن ہے۔ اس نے وہ بات اب بھلا دی ہو۔

گرلسی نے بوتل کے منہ کھولنے کے لئے زور سے ٹھوکر لگائی۔ بوتل کھل گئی۔ گیس کا رخ کانگ فوا کے قدموں کی طرف تھا۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری بوتل خالی کر دی گئی۔ لیکن آگ کسی طرح نہ رکی۔ بلکہ بڑھتی ہی گئی۔ اب آ کہرا تک نظر نہ آتا تھا۔ دھوئیں، اور آگ کی گرمی کی وجہ گرلسی آگ بجھاتے بجھاتے بے ہوش ہو کر زمین پہ گر پڑی۔ ادھر بے چارے کانگ فوا کو آگ کے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

آگ بجھانے والے انجن نے بازار میں اپنا راستہ نکال لیا تھا۔ دس منٹ کے اندر اندر اس نے آگ پر قابو پا لیا۔ گرلسی فرش پر بے ہوش

پڑی تھی۔ اس کے گرد کچھ آدمی کھڑے اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کر رہے تھے۔ اور جب اس کی گردن پر پانی ڈالا گیا۔ اور منہ میں برانڈی ٹپکائی گئی۔ تو وہ ہوش میں آ گئی۔ اس کے منہ سے آہستہ سے کوئی آواز نکلی :-

وہ سسکی بھر کر کہنے لگی۔ "میں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے اسے اور اس کی دکان کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کی آخر ہوا کیا؟ کیا وہ صحیح سلامت ہے؟"

"اچھی لڑکی! فکر مت کرو، بات گئی آئی ہوئی ہے۔ تم نے واقعی بہت بہادری کا ثبوت دیا ہے۔ افسوس ہم اسے بچا نہ سکے۔ وہ بچارا ہمارے آنے سے پہلے ہی جل بھن چکا تھا۔ آخر اس زبردست آگ پر گیس کیا اثر کر سکتی ہے۔ تم نے حد سے زیادہ بہادری دکھائی ہے۔ اتنا زبردست خطرہ کون مول لیتا ہے"

بڑی تحسین و آفرین کے بعد گریسی کو اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا گیا اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ اور وہ کانپ رہی تھی۔ اس کے ساتھی اسے گھر لے گئے۔

دوسرے دن اس حادثے کی تحقیقات ہوئی۔ بہت سے گواہوں کی شہادتیں لی گئیں۔ گواہوں میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بھی شامل تھا۔ جنہوں نے شروع سے لے کر آخر تک تمام واقعہ اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ پولیس کے افسر اعلیٰ اور فائر بریگیڈ سپرنٹنڈنٹ نے نہایت شاندار الفاظ میں گریسی کی بہادری غیر معمولی جرأت اور عقلمندی کی داد دی۔ رائل سولین سوسائٹی کی رپورٹ میں یہ لکھا گیا۔ کہ "اگرچہ اس حادثے میں کانگ فا کی موت واقع ہو گئی —

لیکن اس کی یہ وجہ نہیں کہ کسی نے اسے بچانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت کیا۔ ایک لڑکی گریسی گڈ نائٹ نے اس خوفناک حادثہ میں اپنی جان پر کھیل کر اسے بچانے کی جان توڑ کوشش کی۔ اس نے ایک عظیم الشان کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ اور کسی عورت کو اس سے زیادہ بہادری کی توقع نہیں ہو سکتی۔"

جب عدالت برخاست ہوئی تو لوگوں نے گریسی کی تعریف میں خوب تالیاں بجائیں۔ اخبار کے چار نمائندوں نے اس کے حسین سر کے فوٹو لیئے۔ ان تصویروں میں اس کے لب پر تبسم تھا۔

اور اب جبکہ کانگ فو مر چکا ہے۔ دنیا میں صرف گریسی گڈ نائٹ ہی ایک ایسی لڑکی ہے۔ جسے یہ بات معلوم ہے کہ ایک دن کانگ فو نے بیمہ کمپنی کو دھوکہ دینے کے لئے ان بوتلوں سے گیس نکال لی تھی اور اس کی جگہ مٹی کا تیل بھر دیا تھا۔

(طامس برک)

فلسفی کی بیوی

ڈاکٹر نے نہایت غمناک آواز میں کہا۔" اب اُسے صرف خدا ہی بچا سکتا ہے"
یہ سنکر ہنری کا چہرہ بھی اپنی نوخیز بیوی کے چہرے کی طرح زرد
ہوگیا۔ مریضہ کو شاید موت کا بھیانک ہاتھ صاف صاف نظر آرہا تھا۔ وہ ہنری
کے سامنے اس پلنگ پر لیٹی دم توڑ رہی تھی جس پر انہوں نے کبھی عیش و
عشرت کی بہترین گھڑیاں بسر کی تھیں۔

ہنری کے دل میں ایک ٹیس سی لگی۔ شدت درد سے اس کی چیخ
نکلنے ہی والی تھی۔ کہ اس نے بمشکل تمام اسے ضبط کر لیا۔ اپنے چہرے کی یاس
انگیز کیفیات کو چھپانے کے لئے وہ دوڑ کر پاس کے کمرے میں چلا گیا۔ اور آرام کرسی
پر جا گرا۔ اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر زار و قطار رونے لگا۔

آہ غریب لیٹزا! وہ اس کی زندگی کی تنہا و تاریک شاہراہ پر شبنم کی
طرح یا کسی پھول کی طرح نمودار ہوئی تھی۔ حسن اور جوانی کے اس مجسمہ

کا تصوّر اب تک اس کے سامنے تھا ـــــ وہ اس کے مطالعے کے گرد آلود کمرے سے چمگادڑوں اور پروانوں کو اُڑا رہی تھی۔ وہ اس لئے آئی تھی کہ کھڑکی کھول دے اور چمکتا ہوا سورج اور قدرت کے خوبصورت نظارے کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے والے کو نظر آسکیں ...... اب اس کی کتابیں اپنے حریف سے ایک ظالمانہ انتقام لے رہی تھیں۔

ہنری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

لیکن ـــــ اس فوری اور لرزہ خیز مصیبت کا کوئی تدارک نہیں ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی غم کے بھوت کے خوفناک چنگل میں اسی طرح تنہا بلا مقابلہ رہے ؟ سالہا سال تک ان کتابوں پر جھکے رہنے سے، پڑھ پڑھ کر چہرہ زرد کر لینے سے، اور دوسروں کے گوناگوں تجربات کا فائدہ اٹھانے سے آخر حاصل کیا ہوا؟ آخر یہ مطالعہ میرے کس کام ہے کہ میں اتنی ذہنی کوفت میں مبتلا رہوں۔ اور یہ مجھے اس سے رہا کرنے سے قاصر ہے۔ اگر اس کی وساطت سے بدقسمتی کی دیوی معقول شرائط پر میری طرف دستِ تعاون نہیں بڑھا سکتی۔ تو ایسا مطالعہ بھاڑ میں جائے، آخر ایسے مطالعہ اور سوچ بچار کا فائدہ؟

او فلسفہ! آکر مجھے بچا۔ تو جو ہمارے اردگرد کی چیزوں کی ظاہری نہیں۔ بلکہ اصلی صورت دیکھتا ہے۔ تو جو ہر چیز کے لئے صورت جواز ڈھونڈ لیتا ہے۔ اور کسی چیز کو دیکھ کر حیرت زدہ نہیں ہوتا۔ تو نے آئی قور کو غربت سے نجات دلائی تھی۔ تو نے سقراط کی موت کو تجربے اور بحث کی بنیاد ٹھیرا

لیا تھا۔ تو نے مارکس کی سلطنت کو علوم و فنون کا مرکز بنا دیا تھا۔ تو اُن لوگوں کو تباہ نہیں کرتا جو تجھ سے محبّت کرتے ہیں۔ مجھے تسکین دے تو اپنی شاندار اور بلند ممالک سے جہاں خموشی کا راج ہے۔ ہماری دُنیا کو دیکھ رہا ہے کہ اس کی کیا حقیقت ہے۔ یہ ایک نقطہ ہے، ایک غیر مرئی نقطہ۔ پھر اس نسلِ آدم کی حقیقت کیا ہے۔ جو اپنے دلوں میں خواہشات کا طوفان چھپائے ہوئے ہے۔

او فلسفہ! اگر تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا نہیں کر سکتا تو کم از کم مجھے کسی قدر سرد مہر تو بنا دے۔ اور مجھے تسلی دے۔ تو کہتا ہے کہ کوئی برائی ایسی نہیں جس سے کوئی نہ کوئی اچھا نتیجہ نہ نکلتا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قدرت گوناگوں خوبیوں سے مالا مال ہے۔ سیاہ بادلوں پر صاف آسمان چمکتا ہے۔ بادل کھل جائیں گے۔ لیکن چمک نہیں کھل سکتی ....«

او انسان! اگر زندگی تیرے لئے ایک دردناک آہ ہے۔ تو کیا موت اس کا علاج نہیں اور اگر دُکھ کا علاج موت ہے۔ تو اے انسان! تو موت سے کیوں بچتا ہے؟ اس پر کیوں لعنت بھیجتا ہے۔ اور جن جن ہستیوں سے تجھے محبّت ہے۔ تو کیوں انہیں موت سے بچاتا ہے؟«

«اُن ہستیوں کو جن سے تجھے محبّت ہے — ہاں ..... لیکن کیا ہم ہمیشہ ہی کسی سے محبّت کر سکتے ہیں — لیزا کتنی پیاری۔ کتنی حسین ہے۔ لیکن درازیٔ عمر اُسے بدصورت بنا دیتی۔ لیزا اچھی ہے ..... لیکن بدصورتی اس کا چہرہ مکا آدل کا سا بنا دیتی۔ اگر وہ اب مر جائے — یعنے

نوعمری ہی میں اس کا انتقال ہو جائے۔ تو ہمیشہ کے لئے میرے دل میں اس کی شیریں اور خوبصورت یاد رہ جائے گی ــــــ وہ ہمیشہ میرے تصور میں جوان، خوبصورت اور شیریں ادا بن کر رہے گی۔ اور ہمیشہ میری ہی محبوبہ بن کر رہے گی۔ محبت کی غذا خواہشات کی تکمیل نہیں۔ بلکہ خواہشات کا نامکمل رہ جانا ہے۔ سو کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ میری محبت آمیز خواہشات کو پورا کرنے کی بجائے مر جائے۔ آخر میں مطالعہ کرنے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ اس کے لئے تنہائی کی ضرورت ہے۔ بیوی اور خصوصاً حسین بیوی کی موجودگی میں آدمی کو گھر بھر کے کاموں میں دخل دینا پڑتا ہے۔ کچھ وقت اس سے محبت کرنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور تمام ضروری کام سرانجام نہیں ہو سکتے ــ جو شخص ایک پگڈنڈی پر نہیں چلتا۔ وہ کبھی صحیح طریقہ سے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ جو شخص اپنی دانائی کی کمان کو ایک ہی چیز کا نشانہ کرنے کے لئے نہیں جھکاتا۔ وہ کوئی شکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہمیں قادر مطلق کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ جو غم کے فائدہ مند امتحان کی راہ سے ہمیں منزل حسرت تک پہنچاتا ہے ..... ہماری کتابیں منتظر ہیں۔ کہ ہم انہیں پڑھیں۔ ان کے حاشیوں کی باریک باریک عبارت پڑھ کر فائدہ حاصل کریں۔ اور زندگی کے حقیقی راز پائیں .... وہ تو منتظر ہیں۔ کہ کوئی ہمیں کھولے اور ہمارا خزانہ لوٹ لے .... کتابیں ہی ہماری ابدی دوست ہیں ......"

فلسفی کی ہچکیاں اب ختم ہو چکی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو خشک ہو گئے تھے

اس کی نگاہوں میں خشم مندی کی ایک چمک تھی۔ فلسفہ جیسے وُہ اس قدر محبّت اور بے تابی کے ساتھ پلا رہا تھا ۔ اس کی گود میں آ بیٹھا تھا۔ اور اس کا سر فلسفی کے شانوں پر جھکا تھا......

ڈاکٹر مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا ۔ پہلے کی طرح اس کا چہرہ مایوس اور تاریک نہیں تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "مریضہ کی جان بچ گئی ہے!" ڈاکٹر نے لرزتی ہوئی آواز میں چلا کر کہا۔

"کیا سچ مچ؟" اس نے جواب دیا ۔ اس کی آواز پہلے سے بہت بھاری ہو گئی تھی ۔ کیا اس وقت اس کے دل میں جذبات محبّت کا سمندر موجزن تھا۔؟ جذبات کے ماہر ذرا بتائیں تو!

(کارلو دوسی)

افسانۂ مہر و وفا

وہ دونوں جن کے دل بے لوث تھے اور جنہوں نے ہمیشہ ایکدوسرے سے پاک محبت کی تھی۔ راہبوں کی خانقاہ کے ایک کمرے میں وقت مقررہ پر آ پہنچے۔ فرائر آکرتو نے اپنی محبوبہ کو اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگا۔ "میری پیاری سیکطیرنینا آج میں تمہیں عشق و محبت کی ایک دردانگیز داستان سناؤں گا۔ یہ ایک سچا واقعہ ہے۔ اور بہت دن نہیں گزرے کہ سیاتا میں گھر گھر اس کے چرچے ہو رہے تھے۔"

سیاتا میں کانگاتو نامی ایک عالی نسب اور شریف النفس نوجوان رہتا تھا۔ مال و دولت کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ خوش اخلاقی۔ بہادری اور فہم و فراست کے جوہر نے اسے ہر دلعزیز بنا رکھا تھا۔ آہ اس سے آگے میں تمہیں کیا بتاؤں؟ سوائے اس کے کہ بدقسمتی سے اسے منوشیا نامی ایک عورت سے محبت ہو گئی۔

یہ عورت ہمارے بہادر سردار میسٹر سٹرنگا کی بیوی تھی۔ سو ہمارے نوجوان دوست نے محبت تو ضرور کی۔ لیکن بہت دیر سے . . . لیکن پیاری سیلوریتا کہیں کسی سے ان باتوں کا ذکر نہ کر دینا۔

ہاں تو گاگا لنگانو کی محبت کوئی معمولی محبت نہ تھی۔ وہ آگ کی طرح بھڑک اُٹھی۔ اور آندھی کی طرح اُس کی رُوح پر چھانے لگی۔ یہاں تک کہ نوجوان گا لنگانو ہمہ تن منوشیا بن گیا۔ ایک دن موقع پا کر اس نے اپنی محبوبہ کا ایک دستانہ چُرا لیا۔ اور اُسے اپنا عزیز ترین متاع سمجھنے لگا۔ وہ ہر وقت اسے اپنے ہاتھ میں پہنے رکھتا۔ ہر دعوت اور ہر جشن مسرت میں اس کے نفیس ترین لباس کا ایک جُز یہ دستانہ بھی ہوتا۔ اس کا خیال تھا کہ منوشیا جب میرا طرز عمل دیکھے گی تو اُسے معلوم ہو جائے گا۔ کہ مجھے اس سے کس قدر محبت ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں منوشیا کو گا لنگانو پر مائل نہ کر سکیں۔ وہ پہلے ہی کی طرح تغافل شعار رہی۔

اپنی محبوبہ کا یہ رویہ دیکھ کر گا لنگانو کی جو حالت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ اس وقت اس کی حالت ایک ایسے مظلوم کی سی تھی۔ جس پر انتہائی تشدد ہوا ہو۔ منوشیا کسی طرح اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتی تھی۔ ادھر گا لنگانو کی یہ حالت تھی کہ اسے منوشیا متاع دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ منوشیا تو اپنے عاشق کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے محبت کا ایک لفظ تک سُننے کو تیار نہ تھی۔ لیکن ہمارا نوجوان دوست سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ ہمیشہ اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ اگر کسی ضیافت، کسی جشن یا کسی محفل میں ان دونوں

کو شریک ہونے کا موقع ملے۔ تو وہ اپنی محبوبہ کے بہت قریب بیٹھے۔

نہ معلوم وہ بے چارہ کتنی مدت تک اپنی سنگدل محبوبہ کو پیغام پر پیغام بھیجتا رہا۔ اس نے اسے ہزاروں قیمتی تحائف بھیج ڈالے۔ لیکن یہ سب باتیں بے سود ثابت ہوئیں۔ محبت کے پیغامات کو شریف النفس خاتون بے معنی الفاظ سمجھتی رہی۔ وہ ایک لفظ تک سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ اور اس کے تحائف ہر مرتبہ اس نے ٹھکرا دیئے۔ جوں جوں اس کا اضطراب بڑھتا گیا۔ منوشیا زیادہ ترش رو اور خاموش ہوتی گئی۔

گانگا نو کی قیمت میں یہی یاد لکھا کہ محبت کی گرمی کی طرح اسے پگھلائے بعض اوقات وہ محبت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ اور دل ہی دل میں کہتا کہ "اے محبت! اے قسمت! کیا تو اسی طرح تادم زلیست میری روح کو آتش فرقت میں تحلیل ہونے دیکھا کرے گی۔" "میری روح کس قدر عشق آشنا ہے۔ لیکن اس روح سے کوئی آشنا پیدا نہیں کرتا تھا۔ محبت کی سنگدل دیوی! کیا تو اپنے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتی ہے۔"

اپنی محبوبہ کے ظلم کی انتہا دیکھ کر وہ غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا اور کچھ عرصہ نا امید رہنے کے بعد وہ پھر اپنے دل میں پورا پورا عزم کرلیتا کہ میں بار محبت کو جو میں نے کبھی اٹھایا تھا نیچے نہیں پھینکونگا ——— وہ انتہائی یاس میں کسی خوشگوار لمحے کا انتظار کرنے لگتا جس کا انتظار بے سود تھا۔ تاہم ہر وقت وہ یہی کوشش کرتا کہ کسی نہ کسی طرح اپنی محبوبہ کی نظروں میں ویسا ہی بن جائے جیسا وہ کبھی نہیں بن سکتا تھا۔

اب ایسا اتفاق ہوا کہ منوشیا اور اس کا خاوند چند دن اپنے دیہاتی مکان میں گزارنے کے لئے سیاکا پہنچے۔ مریضِ محبت گاں گالو بھی اسی گاؤں کی راہوں پہ بھٹکتا دکھائی دینے لگا۔ وہ اپنے ہاتھ پر اپنا شکرہ بٹھا کر تمام دن یہاں ہر وقت چکر لگاتا رہتا۔ گویا اس کو شکار کا بڑا شوق ہے۔ اور وہ اس مقصد کے لئے مارا مارا پھر رہا ہے۔ ایک دن وہ پھرتا پھراتا منوشیا کے مکان کے اس قدر نزدیک آ پہنچا کہ منوشیا کے شوہر میسر ٹریکا نے اسے دیکھ کر پہچان لیا۔ میسر ٹریکا اس سے نہایت مہربانی سے پیش آیا۔ اور اس نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا۔ کہ " اگر آپ اس وقت ہمارے گھر تشریف لے چلیں تو ہم لوگوں کو بہت مسرت ہوگی۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ شام تک ہمارے ساتھ رہیں گے "

گاں گالو نے اپنے دوست کا نہایت مخلصانہ الفاظ میں شکریہ ادا کرتے ہوئے جانے سے انکار کر دیا۔ اور یہ بہانہ کر دیا کہ میں آج کسی اور جگہ مدعو ہوں اور حالات ایسے ہیں کہ مجھے افسوس ہے میں وعدہ شکنی نہیں کر سکتا۔ اس پر میسر ٹریکا نے اسے تھوڑی دیر کے لئے ہی گھر آ کر چائے پینے پر مجبور کیا۔ لیکن گاں گالو نے اسے صاف جواب دیدیا کہ " آپکا بہت بہت شکریہ دوست! مجھے بہت جلدی جانا ہے خدا حافظ۔"

جب میسر ٹریکا بھی الوداع کہہ کر چلا گیا۔ تو گاں گالو نے دل میں اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ کہ میں نے کیوں ایسے موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ میں کتنا احمق ہوں۔ مجھے چاہیئے تھا۔ کہ کم از کم منوشیا ہی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے وہاں چلا جاتا جو مجھے دُنیا کی ہر چیز سے عزیز تر ہے۔

ایسے ہی خیالات کا ہجوم دل ودماغ میں لیکر وہ تنہا راہ پر چلتا گیا۔ یکایک
اسے ایک بہت بڑا نیل کنٹھ دکھائی دیا۔ اس نے جھٹ اس پر اپنا شکرا چھوڑ
دیا۔ اب شکرا نیل کنٹھ کا تعاقب کرتے ہوئے میسرسٹریکا کے باغ میں جا پہنچا۔
دونوں پرندوں میں جنگ شروع ہوئی۔ شکرے کی خوفناک چیخیں سنکر شوھر اور
بیوی دوڑکر اس کھڑکی کے قریب آگئے جو باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اور انہوں نے
دیکھا کہ کس بہادری اور سلیقے سے شکرا اپنے خوفناک شکار پر جھپٹتا ہے
بیوی کو خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ یہ شکرا اس کے عاشق کی ملکیت ہے۔
بڑی بے تکلفی سے اپنے شوہر سے کہنے لگی۔"یہ پرندہ کس کا ہے۔
ایم سٹریکا نے جواب دیا۔" ذرا اسے غور سے تو دیکھو۔ یہ اپنا کام کس قدر
عمدگی سے سرانجام دیتا ہے۔ یہ اپنے آقا سے کیتنا ملتا جلتا ہے۔ اس آقا سے
جو سیانا کے خوبصورت ترین اور قابل ترین نوجوانوں میں سے ہے "
"اس نوجوان کا نام کیا ہے ؟" سٹریکا کی بیوی نے بے پروائی کے انداز
میں پوچھا۔
" اس کا نام ؟ شریف النفس نوجوان گالگانو کے سوا وہ کون ہو سکتا
ہے۔ اور وہ اخلاص کا پتلا تو تھوڑی ہی دیر ہوئی یہاں سے ہو کر گیا ہے۔ میری
خواہش تھی کہ شام کا کھانا وہ ہمارے ہی گھر کھائے۔ لیکن اس نے میری بات
نہ مانی۔ یقیناً وہ اُن آدمیوں میں سے ہے۔ جو میرے نزدیک نفس ترین اور
نہایت ہی خوش طبع ہیں۔
یہ کہہ کر میسرسٹریکا اٹھ کر کھڑکی سے پرے کھانا کھانے چلا گیا۔ اس عرصے

ہیں گانگانو نے اپنے شکرے کو پاکر چپکے سے اپنی راہ لی۔ لیکن مسٹر لیکا نے منوشیا کے سامنے جو گانگانو کی تعریفیں کی تھیں۔ ان کا اس کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اتنا اثر جتنا اس کے عاشق کی التجاؤں اور منتوں سے بھی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ گھنٹوں اپنے عاشق کے متعلق شوہر کی زبان سے کہے ہوئے الفاظ پر نہایت ہمدردی سے غور کیا کرتی۔

حسن اتفاق سے کہ انہی دنوں اہل سپانا میں سے میسر شرلیکا کو پیرا گیا بھیجنے کے لئے نمائندہ منتخب کیا گیا۔ تنگیٔ وقت کی وجہ سے اسے فوراً اپنی بیوی کو خدا حافظ کہنا پڑا۔ جونہی مسٹر لیکا سفر کو روانہ ہوا۔۔۔۔ اپنے شریف النفس عاشق کی یاد سنگدل عورت کے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اس نے فوراً اپنے عاشق کی طرف ایک قاصد بھیجا اور اپنے شوہر کی طرح اسے شام کے کھانے پر مدعو کیا۔ گانگانو میں بھلا انکار کی ہمت کب تھی۔ فوراً شکریہ ادا کرتے ہوئے پیغام بھیجا کہ میں ضرور حاضر ہونگا۔ چنانچہ شام کو مناسب وقت پر وہ اپنی محبوبہ کے گھر کو روانہ ہو گیا۔۔۔۔ اس محبوبہ کے گھر کی طرف جن کے لئے اس نے اتنی روحانی کوفت برداشت کی تھی۔

منوشیا کے گھر کے سامنے آ کر اس نے اپنا گھوڑا ٹھیرایا۔ ایک ہی لمحہ بعد وہ اس کے سامنے تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے پاؤں میں لغزش آ گئی اور وہ اس کے قدموں پر گر گیا۔ منوشیا نے بڑی مسرت سے اسے اپنے قدموں پر سے اٹھا لیا۔ اور اسے فرط محبت سے ہزار مرتبہ خوش آمدید کہی۔ اسے موسم کے بہترین پھل اور دوسری لذیذ اشیاء پیش کیں۔ شام کے کھانے میں میز پر طرح طرح کی بیسیوں چیزیں موجود

تھیں۔ لیکن ان سب چہروں سے زیادہ دلکش اور دلنشین اس خاتون کا حسن
درخشاں تھا۔ جو فضاؤں میں نور اور مسرت کی بارش کر رہا تھا۔ اب حالت یہ تھی
کہ حرماں نصیب عاشق اپنے دردِ محبت اور فرقت کی کہانی سنا رہا تھا۔ لیکن محبوبہ
کی کنول کی سی خوبصورت پیشانی پر بل نہیں تھے۔ اب وہ اسے دیکھتے ہی منہ
نہیں پھیر لیتی تھی۔ عاشق کا دماغ آسمان پر تھا۔ اور حیرت و حسرت اس کے چہرے
سے عیاں تھی۔ جسے وہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اپنی محبوبہ کا یہ غیر
متوقع طور پر بدلا ہوا رویہ اسے حیرت میں ڈال رہا تھا۔ آخر عاشق نے محبوبہ سے
پوچھا۔ "کیا تمہیں کبھی مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی؟"

وہ ایک دلنشین ادا کے ساتھ بولی۔ "میں تم سے دل کی ایک ایک کہہ ڈالتی
ہوں۔ اور اسی لئے تو میں نے تمہیں بلایا ہے۔" یہ کہہ کر اس کا چہرہ مغموم ہو گیا۔
اور پاک محبت کے نور سے چمک اٹھا۔

گنالنگا نو کسی قدر متعجب ہو کر بولا۔ "آج صبح جب میں نے سنا کہ اتنا عرصہ
مجھے حیران اور افسردہ رکھنے کے بعد تم نے مجھے بلایا ہے تو میرے دل پر ایک عجیب
کیفیت طاری ہو گئی۔ ایسی کیفیت جس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔"

منوشیا بولی۔ "میری بات سنو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دیتی ہوں۔ لیکن تم ذرا
میرے قریب آکر بیٹھو۔ آہ! مجھے تم سے محبت ہے۔ چند دن ہوئے تم شکار کھیلتے
ہوئے ہمارے گھر کے قریب سے گزرے اور میرے شوہر نے مجھے بتایا کہ اس سے تمہاری
ملاقات ہوئی ہے۔ اس نے تمہیں گھر آنے کی دعوت دی۔ لیکن تم نے انکار کر دیا۔
ہاں اسی دن کا ذکر ہے کہ تمہارا شکرہ شکار پہ جھپٹا۔ جب میں نے اس

پرند کو بہادری کی جنگ لڑتے ہوئے دیکھا۔ تو حیران ہو کر اپنے شوہر سے پوچھا۔" یہ پرند کس کا ہے ؟" اس نے جواب دیا۔" سیانا کا بہترین نوجوان اس کا مالک ہے تم دیکھتی نہیں ہو کہ اس کی بیباکی اور بے جگری کا انداز گا لنگا نو سے ملتا جلتا ہے ؟ "

گا لنگا نو پکار اٹھا۔" کیا سچ مچ اس نے یہی کہا ؟ "

موتوشیا نے جواب دیا۔" ہاں بلکہ اس نے کئی دفعہ مجھ سے تمہاری تعریفیں کی ہیں۔ میں نے تمہاری اتنی تعریفیں سنیں کہ مجھے افسوس ہونے لگا۔ کہ میں تمہیں کس قدر دکھ پہنچاتی رہی ہوں۔ سو میں تمہیں یہاں بلانے پر مجبور ہو گئی۔"

موتوشیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے سسکتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا۔ کہ" میرے شوہر کو مجھ سے بے حد محبت ہے ! "

" کیا یہ سچ ہے ؟ " گا لنگا نو نے پوچھا۔

" آہ ! یہ سب سچ ہے !" موتوشیا نے جواب دیا" میں نہیں جانتی کہ ایسا کیوں ہے۔ کاش میرا شوہر میرے سامنے تمہاری اتنی تعریفیں نہ کرتا۔"

چند منٹ کی کشمکش کے بعد حرماں نصیب گا لنگا نو نے موتوشیا کے دونوں ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور کہا۔

" آہ ! اس صورت میں خدا مجھے اجازت نہیں دیتا۔ کہ میں ایک ایسے شخص کو نقصان پہنچاؤں۔ جس نے مجھ سے اتنی مہربانی کا سلوک کیا ہے ...... اور جو مجھ سے اس قدر اخلاق سے پیش آتا رہا ہے۔"

یکایک وہ اٹھ کھڑا ہوا ...... اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اور اس نے

نہایت دردانگیز الفاظ میں خاتون کو الوداع کہی۔

موفوشیا اور گالنگانو، دونوں کی آنکھوں میں محبت کے آنسو تھے —— محبت کے آنسو —— اب بھی ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی —— ایسی محبت جس میں ہوس کو مطلق دخل نہ تھا —— ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کا احترام موجود تھا۔۔۔۔۔

اس واقعے کے بعد گالنگانو کی محبت بالکل خاموش ہو گئی۔ وہ اب بھی ان کے گھر جایا کرتا۔ لیکن اب کبھی اس نے اپنی محبت کا اظہار نہ کیا۔

(گیووانی فیرنیٹینو)

خونخوار دیو

سیر و تفریح کی وہ دخانی کشتی ہمیں قسطنطنیہ سے جزیرۂ پنکی پو کے ساحل پہ لے آئی ۔ اور ہم ساحل پہ اُتر آئے ۔ کشتی میں کچھ زیادہ بھیڑ نہ تھی ایک پولش خاندان کے چار افراد ، ماں باپ ان کی بیٹی اور اس کا شوہر ۔ ان کے علاوہ ہم دو ـــــــــ بس یہ تھی کشتی کی کل کائنات ۔ مگر جب ہم کشتی کے اس پل کو عبور کر رہے تھے ۔ جو شاخ زریں اور قسطنطنیہ کو باہم ملاتا ہے تو ایک نوجوان یونانی بھی ہم سے آملا ۔ یہ غالباً کوئی مصوّر تھا ۔ کیونکہ اُس نے اپنی بغل میں اس قسم کا ایک بستہ دبا رکھا تھا ۔ جو عموماً مصوّروں کے پاس ہوتا ہے ۔ اس کے کندھے پہ اس کے لمبے لمبے بالوں کی لٹیں لٹک رہی تھیں ۔ چہرہ زرد تھا ۔ اور سیاہ آنکھیں گہرے حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں ۔

مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی ۔ کیونکہ وہ بہت خوش گفتار تھا ۔ اس

علاوہ وہ مقامی ماحول اور مقامات سے بھی اچھی طرح آشنا تھا۔ لیکن وہ اِتنا قانونی تھا کہ بالآخر میں تنگ آ کر اس سے کنارہ کش ہو گیا۔

یہ پولش گھرانا بھی بہت خوش اخلاق اور خوش واقع ہوا تھا۔ باپ اور ماں دونوں انتہائی تکلیف کے ساتھ مجھ سے باتیں کرتے تھے اور اُن کا خوبصورت داماد بھی ایک آزاد طبیعت کا مالک تھا۔

یہ لوگ لڑکی کی خاطر جو کچھ مریض سی معلوم ہوتی تھی۔ یونان میں گرمیاں گذارنے آئے تھے۔ لڑکی بلا کی حسین تھی۔ مگر اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کسی نہائیت خطرناک مرض سے صحت یاب ہوئی ہے۔

وہ اکثر اپنے شوہر کا سہارا لے کر چلتی تھی۔ اور راستے میں تھک کر دم لینے کے لئے بار بار بیٹھ جاتی تھی۔ وہ اپنے اعزہ سے سرگوشیاں بھی کرتی۔ لیکن ہلکی سی خشک کھانسی کا دورہ بار بار اس کی سرگوشیوں کے سلسلے کو منقطع کر دیتا۔

جب اسے کھانسی کا دورہ پڑتا۔ تو وہ اور اس کا شوہر دونوں راستے میں رُک جاتے۔ شوہر اپنی رحم آلود اور تشویش انگیز نگاہوں سے اسے دیکھتا اور جواب میں اس کی حسین بیوی کی نظریں یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتیں " نہیں نہیں مَیں اچھی ہوں۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ "

اس یونانی نوجوان کے ایما پر جو کشتی سے اُترتے ہی ہم سے جُدا ہو گیا تھا۔ ہم نے پہاڑی پر کے ہوٹل ہی میں قیام کیا۔ ہوٹل والا کوئی فرانسیسی تھا۔ اس نے ہوٹل کی عمارت کو نہایت خوش ذوقی سے فرانسیسیوں کے ذوق کے مطابق آراستہ کر رکھا تھا۔

ہم سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ جب دوپہر کی حدت قدرے کم ہوئی۔ تو ہم سب پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ اور سائبیرین چیڑوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر خوبصورت پہاڑوں کے دلکشا مناظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔

ابھی ہم لوگوں کو وہاں بیٹھے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ کہ وہ یونانی نوجوان پھر نمودار ہوا۔ اس نے ہمیں آہستہ سے سلام کیا۔ اِدھر اُدھر گھبرائی ہوئی نظریں ڈالیں اور پھر ہم سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنا بستہ کھولا اور کوئی تصویر بنانے میں مشغول ہوگیا۔

میں نے سمجھا کہ وہ جان بوجھ کر چٹانوں کی طرف پیٹھ پھیر کر بیٹھا ہے۔ تاکہ ہم اس کی تصویر نہ دیکھ سکیں۔

نوجوان پول کہنے لگا۔" ہمیں اس کی تصویر دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا ہمیں یہ دل فریب کوہستانی منظر نظر نہیں آرہے۔"

کچھ دیر ٹھیر کر وہ پول نوجوان پھر بولا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم لوگوں کو بھی اپنی تصویر میں شامل کر رہا ہے۔ اچھا خیر کیا ہرج ہے۔"

اور حقیقت میں ہمارے سامنے دیکھنے کی بہت اچھی اچھی چیزیں تھیں یرنکی پوجیسی خوبصورت وادی تو شاید دُنیا بھر میں نہ ہوگی۔ مشہور شہید وطن ٹیرین نے جو چارلس اوّل کا ہمعصر تھا۔ اپنی جلا وطنی کا زمانہ یہیں بسر کیا تھا۔ اگر میں ایک ماہ یہاں گذار سکتا۔ تو تمام عمر انہی مناظر کے حسین تصورات میں گذار دیتا۔ بلکہ میں تو اس ایک دن کو بھی کبھی نہیں بھولونگا۔ جو میں نے یہاں بسر کیا۔

ہوا صبح کے چمکیلے ستارے کی طرح صاف تھی۔ اور ایسی خوشگوار کہ انسان کی روح اس کے ساتھ مل کر پرواز کرنے کے لئے مضطرب ہو اٹھتی تھی۔ دائیں طرف سمندروں سے پرے ایشیائی پہاڑوں کی چوٹیاں اپنے بھورے سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ اور بائیں طرف دور، بہت دور، یورپ کے ڈھلوان ساحلوں پر شفق کی دیوی اپنا زرتار لباس پہنے جگمگا رہی تھی۔

مجمع الجزائر برطانیہ کا ایک حسین جزیرہ "چاکی" جو نسبتاً ہمارے زیادہ قریب تھا۔ اپنے سرو صنوبر کے جنگلوں کو دامن میں لئے ہوئے سمندر میں بیٹھا تھا۔ اور یہ منظر کچھ ایسا حسین تھا کہ اس پر کسی مغموم خوابگاہ کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے ہرے بھرے درختوں کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں اور اس کے سر پر ایک شاندار عمارت کھڑی تھی۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہ عمارت اس جزیرے کے سر کا تاج ہے۔ یہ جگہ ان لوگوں کی مسکن تھی جن کے دل بیمار ہو جاتے ہیں۔

بحیرۂ مارمورا میں بلور کے ٹکڑوں کی طرح رنگ رنگ کی چمکیلی لہریں اٹھ رہی تھیں اور دور، بہت دور، پانی دودھ کی طرح سفید موم ہو رہا تھا۔ کبھی کوئی سبز رنگ کی لہر اٹھتی۔ کبھی گلابی رنگ کی۔ غرضیکہ ہر طرف آتشیں رنگوں کی لہریں کلیلیں کرتی نظر آتی تھیں۔ اور ہمارے نیچے سبزی مائل نیلا سمندر ہچکیاں لیتا نظر آ رہا تھا۔

سمندر کی سطح پر کوئی بڑا جہاز نظر آتا تھا۔ صرف دو چھوٹی چھوٹی کشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ جن پر انگریزی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ان میں سے ایک

توفانی کشتی تھی۔ اور دوسری کو بارہ آدمی چپوؤں سے چلا رہے تھے اور جب چپو یکایک پانی سے اٹھتے تھے۔ تو ان سے پگھلی ہوئی چاندی کے چمکتے ہوئے قطرے نیچے گرنے لگتے۔

سادہ لوح مچھلیاں سطح بحر پر بار بار اچھلتی تھیں اور بگلے ان آڑھی ترچھی قطاریں باندھ باندھ کر اڑ رہے تھے۔ کبھی کبھی دونوں بادلوں کے درمیان نیلگوں آسمان پر خاموش اور مطمئن عقاب بھی پرواز کرتے نظر آتے۔

پہاڑی کا ڈھلوان حصہ جس پر ہم بیٹھے تھے۔ زنگار رنگ کے پھولوں سے بھرا تھا۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے ہوا بوجھل ہو رہی تھی۔ اور اس قہوہ خانے میں جو سمندر کے قریب تھا۔ موسیقی کی لہریں صاف ہوا کے ساتھ مل کر ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

یہ کیفیت بہت سحر انگیز تھی۔ ہم خاموش بیٹھے تھے۔ ہم نے اپنی روحوں کو ان رشکِ جنت مناظر میں غرق کر رکھا تھا۔

نوجوان لڑکی اپنے شوہر کا سہارا لئے سبزے کے فرش پر لیٹی تھی۔ یکایک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اس کی آنکھوں کے آبدار موتی خاک میں ملتے دیکھ کر مجھے اس کی حالت پر رحم آگیا۔ اور میرے دل میں درد کی ہوک اٹھتی تھی۔

"میرا خدا جانتا ہے کہ اگر میرا یہاں کوئی دشمن بھی ہو۔ تو میں اس کو معاف کر دوں۔"

اس کے بعد ہم سب پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ایسی عجیب خاموشی جس

کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔ ہم میں سے ہر ایک کے دل میں ایک خوشگوار احساس کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اور سب کے دلوں پر ایک سی کیفیت طاری تھی۔ کوئی ایک دوسرے سے تعرض نہیں کر رہا تھا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد اس یونانی نے اپنا بستہ لپیٹا۔ جھک کر ہمیں سلام کیا اور وہاں سے چل دیا۔ اس وقت ہم میں سے کسی نے بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔

آخر کئی گھنٹوں کے بعد جب جنوبی مناظر کی وادیوں پر تیرہ نام ادا کی سحر کاریاں طاری ہونے لگیں۔ تو لڑکی کی ماں کہنے لگی۔ "کہ اب ہمیں گھر جانا چاہیئے۔"

ہم اُٹھے اور بے فکروں کی طرح ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور وہاں پہنچ کر ہوٹل کے نفیس برآمدے میں بیٹھ گئے۔

اتنے میں نیچے سے کسی کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہوٹل کا مالک یونانی نوجوان سے دست و گریبان ہو رہا تھا۔

ہم اس منظر کا لطف اٹھانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہوٹل والا غصہ میں بھرا ہوا ہمارے پاس پہنچا۔ اور چلا چلا کر اس آدمی سے کہنے لگا۔

"کیا میرے یہاں اور مہمان ہیں۔ کیا میرے یہاں اور مہمان نہیں ہیں۔ جو تجھ جیسے آدمی کو اپنے پاس رکھوں۔

جب وہ قریب پہنچا۔ تو یوں نوجوان کہنے لگا۔ " ذرا مجھے بھی بتانا۔ یہ شخص کون ہے۔ اور اس کا نام کیا ہے۔"

ہوٹل والے نے زہر آلود نگاہوں سے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا نام؟ اس کا نام کوئی نہیں جانتا ۔ ہم اسے خونخوار دیو کہتے ہیں۔"

" یہ عجیب تجارت ہے۔" ہوٹل والا گرج کر بولا۔ " یہ شخص مُردوں کی تصویریں بناتا ہے ۔ ادھر قسطنطنیہ یا اس کے گرد و نواح میں کوئی مرا۔ اُدھر اس کے ہاں مرنے والے کی تصویر مکمل ہو گئی ۔ یہ موت سے پہلے مرنے والے کی تصویر بنانا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی۔ یہ گِدھ ہے۔ گِدھ ۔"

مارے دہشت کے پول عورت کے مُنہ سے ایک کرخت چیخ نکل گئی بیٹی اپنی ماں کی آغوش میں سرسوں کے پھول کی طرح زرد اور بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اُسے غش آ گیا تھا۔

ایک ہی جست میں پولش لڑکے نے اُتر کر یونانی کو جا دبوچا ۔ ایک ہاتھ سے اس کا گلا دبایا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اس کا بستہ چھیننے لگا۔ ہم اس کے پیچھے اُتر آئے۔ وہ دونوں ریت میں لوٹ رہے تھے بستے کی تمام چیزیں ادھر اُدھر بکھر گئی تھیں ۔ ایک ورق پر اس کی لڑکی کی تصویر تھی ۔ آنکھیں بند تھیں اور سفید پیشانی پر پھولوں کا ایک ہار تھا۔

آخری دن

حسین شہزادی مجھ پر ایک دلنشین نگاہ ڈال کر بولی۔

"میں اپنی عمر کی بائیس بہاریں دیکھ چکی ہوں۔ شہر وانتا کی ہر مجلس میں میرے ہی حسن و جمال کے چرچے ہوتے ہیں ——— موسم سرما کے آخری دنوں کا ذکر ہے۔ کہ ایک روز مجھے ایک خوش پوش نوجوان نے اپنے گھر بلا بھیجا اور پوچھا کہ کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے خلوت میں مجھ سے بات چیت کرسکتی ہیں؟"

میں نے اس کی درخواست قبول کرلی۔ اور جب اس کے گھر پہنچی تو وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "میری ایک بچی ہے۔ جس سے مجھے بیحد محبت ہے، اسوقت وہ سخت علیل ہے۔ بیچاری بہت ہی کمزور ہوگئی ہے۔ میری آرزو ہے کہ اسے از سرنو زندگی اور طاقت حاصل ہو جائے ——— میں چاہتا ہوں کہ کوئی شخص اپنی جوانی کے چند سال قیمتاً یا عاریتاً دے دے۔ اس مقصد کے لئے میں نے ملک کا کونا کونا چھان مارا ہے اگر تم مجھے اپنی زندگی کا ایک

سال بطور قرض دے دو۔ تو میں موت سے پہلے ایک ایک دن کی قسط سے
تمہارا قرض ادا کروں گا جب تم اپنی عمر کا بائیسواں سال طے کر لوگی۔ تو بجائے
تیئسویں سال کے چوبیسویں سال میں قدم رکھو گی۔ اور تمہاری جوانی بھرپور
تر و تازہ اور شاداب ہوگی۔ تم اس ایک سال کے خلا کو بھلا کیا محسوس
کرو گی۔ بخدا میں تمہارے تین سو پینسٹھ دن دو دو تین تین کر کے اپنی موت
کے آخری دن تک تمہیں ادا کر دوں گا۔ اور یہ سودا تمہارے لئے کوئی اتنا
ناخوشگوار بھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب میں تمہیں تمہارے دن واپس
کر دونگا۔ تو بڑھاپے میں بھی تم تیئسویں سال کی سی زندگی کا لطف اٹھا سکو
گی۔ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ اور میں نے
نہایت خلوص دل کے ساتھ خدا سے دعا مانگی تھی۔ کہ اے خدا تو مجھے ایک
ایسی نعمت دے۔ جو آج تک کسی دوسرے کے حصے میں نہ آئی ہو۔ میں
اس سے تین سال "جمع" کر چکا ہوں۔ لیکن ابھی مجھے کئی سال کی ضرورت ہے ایک
سال تم دیدو۔ اور اطمینان رکھو کہ یہ سودا تمہیں مہنگا نہیں پڑے گا۔

مجھ سے چونکہ ہمیشہ ایسے ہی واقعات پیش آتے چلے آئے ہیں۔ اس
لئے میں کچھ زیادہ حیرت زدہ نہ ہوئی۔ اور یہ عجیب غریب قرض دینے پر تیار ہو گئی۔

چند دنوں کے اندر اندر میری عمر میں ایک سال کا اضافہ ہو گیا۔
ایک سال کے اس اضافے کو بھلا کس نے محسوس کیا ہوگا۔

چالیس سال تک مجھے اپنا قرض وصول کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ میں نے
اس میں سے ایک دن بھی وصول نہیں کیا تھا۔

میرے مقروض نے تحریری معاہدے کے کاغذ پر اپنا پتہ بھی لکھ دیا تھا۔ اور ساتھ ہی مجھے ہدایت کر دی تھی۔ کہ اگر تمہیں ایک دو دن یا ہفتے کی ضرورت پڑے تو ایک مہینہ پہلے مجھے اطلاع کر دینا۔ تاکہ مقررہ وقت پر تمہیں مطلوبہ ایام دے سکوں!

چالیس سال کی عمر کے بعد میرا نخلِ شباب مرجھانے لگا۔ میں ایک قدیم قلعے میں رہنے لگی۔ مدت سے ہمارا خاندان اس میں رہتا چلا آیا تھا۔ اب میں سال میں صرف ایک دو بار شہر دوائنا جایا کرتی۔ اور اپنے بوڑھے مقروض کو ایک ایک ماہ قبل لکھ کر اپنے مطلوبہ ایام واپس لے لیا کرتی۔ اس وقت میرے پیکر پر میری عمر کے تیئسویں سال کی سی بہار چھا جاتی ـــــ میں ازسرِنو جوان ہو جاتی ـــــ میں شہر کے بڑے بڑے گھرانوں میں جایا کرتی۔ مجھے جاننے والے میرے چہرے اور پیکر پر نگاہ ڈالتے ہی حیرت زدہ ہو جاتے۔ وہ لمحے میرے لئے بڑے مسرت انگیز ہوتے تھے۔ رات کو میں اپنی انحطاط پذیر جوانی کی وجہ سے تھکی تھکی نظر آتی۔ لیکن صبح کو بستر سے اٹھتے ہی میری رگ رگ میں زندگی اور مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔ اور میں ایک نوخیز ہرنی کی طرح دوڑی دوڑی پھرتی۔ اس وقت میرے چہرے سے بڑھاپے کی تمام شکنیں دور ہو جاتیں۔ میرا بدن نور کے سانچے میں ڈھل جاتا۔ بال سنہری ہو جاتے۔ اور ہونٹ گلاب کے سرخ پھول کی طرح مہک اٹھتے اور اتنے پیارے نظر آتے کہ میں اکثر آئینہ میں اپنے ہونٹوں کے عکس پر فرطِ محبت سے اپنے ہونٹ رکھ دیتی۔ اس اثنا میں وائنا کے نوجوان میری محبت کے جال میں اسیر ہو چکے تھے۔ یہ سب میرے گرد جمع ہو جاتے اور میرے

روپ بدل لینے کو جادو سے تعبیر کرتے انہیں بھلا حقیقت کا علم کیسے ہو سکتا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد میں نے اپنے آپ کو اپنے قلعے میں بند کر لیا۔ کسی کو اجازت نہ تھی کہ وہاں آ کر مجھ سے ملے مگر ایک دن ایک جرمن افسر جو وائنا میں میری زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا۔ کسی پُراسرار طریقے سے میرے کمرے میں آ داخل ہُوا۔ میری بدلی ہوئی صورت اور انحطاط پذیر حُسن کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا۔ اور پھر اس نے دوبارہ کبھی مجلس میں مجھ سے ملاقات کرنے کی کوشش نہ کی۔ میں کبھی کبھی اپنا تھوڑا سا قرض وصول کر کے اپنے شباب کی بہاریں لوٹ لیتی تھی۔ جس سے میری انحطاط پذیر جوانی کا لامتناہی سلسلہ کچھ دنوں کے لئے منقطع ہو جاتا۔ تم لوگ اس عجیب و غریب اور حیرت انگیز زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ جو میں نے گذاری ——— آہ میری عمر کا زمانہ یاس اور پژمردگی میں بسر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میری بے کیف زندگی کا تسلسل ٹوٹ جاتا۔ اور میں ایک دو دنوں کے لئے ایک تیئیس ۲۳ سالہ حسینہ بن جاتی۔

تین سو پینسٹھ دن مجھے بہت کافی معلوم ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں دنوں کی تعداد سے بے پروا ہو کر بلا سوچے سمجھے بوڑھے سے اپنا قرض وصول کر لیا کرتی۔ مگر وُہ بڑا حساب دان تھا۔ ایک دن اس کے گھر گئی۔ حساب کی کاپی دیکھنے پر مجھے معلوم ہُوا۔ کہ دُنیا میں صرف میں ہی ایک ایسی عورت نہیں۔ جس نے اس سے قرض لے رکھا ہے۔ بلکہ اور بھی کئی عورتیں ہیں۔ وہاں میں نے بڈھے کی لڑکی کو بھی دیکھا۔ جس کے چہرے پر موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے کبھی اس بات کے متعلق نہ سوچا۔ کہ بڈھا کہاں سے قرض مانگ کر

مقررہ دن پر یہ قرض ادا کرتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ نئے آدمیوں سے کچھ دن، مہینے یا سال بطور قرض لیکر پرانے آدمیوں کو واپس دے دیتا ہو گا میں حیران ہوں کہ وہ کون سی عورتیں ہوں گی۔ جو زندگی کے محدود ایام میں میری طرح اسے قرض دے سکتی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ ان عورتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ملوں۔ لیکن میں اپنے اس ارادے میں ہمیشہ ناکام ہی رہی۔ بڈھا بڑا عجیب و غریب انسان تھا۔ وہ اپنے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا تھا۔

تم اس صدمے کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو مجھے اس وقت پہنچا۔ جب مجھے نہایت سنجیدگی سے بتایا گیا کہ اب میرے صرف گیارہ دن باقی ہیں۔

کوئی ایک سال تک میں نے اپنے ان واجب الوصول دنوں کی واپسی کا تقاضا نہ کیا۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے مجھے خیال آیا۔ کہ کیوں نہ اس مرتبہ یہ سب کے سب دن واپس لے لوں۔

میرے تمام دن ختم ہونے والے تھے۔ میرا قرضہ بیباق ہوا چاہتا تھا۔ ذرا غور تو کرو۔ صرف ایک دن باقی تھا۔ اور اس کے بعد مسلسل بڑھاپا۔ یاس اور افسردگی!

آہ! صرف ایک پُر نور دن باقی تھا۔ اور اس کے بعد تاریکی ہی تاریکی!

مجھے خود معلوم نہ تھا کہ اس ایک دن میں کیا کیا ہونے والا ہے۔ میں نے سوچا میں اپنا آخری دن کب طلب کروں؟ —— یا میں اسے طلب ہی نہ کروں؟ —— اس قسم کے خیالات میرے دماغ میں چکر لگاتے رہتے تھے۔ تین سال سے میں اپنے شباب کی رنگینیوں سے لطف اندوز نہیں ہوتی تھی۔ اب شاید ہی کوئی دانا میں مجھے جانتا ہو

اب مجھے ایک ایسے دوست کی تلاش تھی۔ جو مجھ سے والہانہ محبت کرے
میں سوچ رہی تھی کہ میرا شکن آلود چہرہ ایک مرتبہ پھر پھول کی طرح شگفتہ ہوگا
اور مرجھائے ہوئے بدصورت ہونٹ آخری بار سرخ گلاب کے پھول کی طرح
سرخ ہو جائیں گے ــــــــ آخری بوسے کے لئے ......"

یہ فقرہ کہہ کر غریب شہزادی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ٹپ ٹپ
زمین پر گرنے لگے۔ میرا دل اس سے ہمدردی کرنے کے لئے بیتاب ہوگیا۔ میں اس
دیوی کے قدموں پر ایک پجاری کی طرح گر پڑا۔ اور اسے یقین دلایا کہ میں سچے دل
سے تمہارا طالب ہوں۔ تم اپنے حسن کا آخری دن میرے لئے وقف کر دو۔

میرے منہ سے تسلی کے فقرے سنکر اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ وہ
کہنے لگی: "ایک ماہ بعد تم مجھ سے مل سکتے ہو ــــ صرف ایک دن کے لئے۔"

ہم نے فیصلہ کر لیا۔ کہ ہم یہ آخری دن اسی پرانے مکان میں بسر کریں گے۔
اور اس کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔

میں نے اپنی محبوبہ سے وعدہ کر لیا تھا۔ کہ میں مقررہ دن سے پہلے اسے نہ ملوں
گا۔ چنانچہ میں اپنے وعدے پر قائم رہا۔ آخر ملاقات کا دن آپہنچا۔ شام ہوئی۔
تو میں نے اس کے گھر کا راستہ لیا۔ مجھے دور ہی سے اس کے گھر کی روشن کھڑکیاں
نظر آرہی تھیں۔ جب میں وہاں پہنچا۔ تو دروازہ کھلا تھا۔ گیلری پھولوں سے
لدی ہوئی تھی۔ میں اندر جا داخل ہوا۔ وہاں لاتعداد کافوری شمعیں روشن تھیں
جنہوں نے کمرے کو بقعہ نور بنا رکھا تھا۔

مجھے میری پیاری نے حکم دیا تھا کہ جب تک مجھے اندر آنے کے لئے نہ کہا جائے

میں باہر ہی کھڑا رہوں۔ ایک گھنٹے کے عذاب ناک انتظار کے بعد میں نے کھانے کے کمرے کی راہ لی۔ وہاں میزوں پر جا بجا طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں کی خوبصورت طشتریاں سجی ہوئی تھیں۔ میں انتہائی جرأت سے کام لیکر شہزادی کے کمرے تک پہنچا۔ دروازے پر دستک دی تو کوئی جواب نہ ملا۔ آخر میں نے آداب مجلس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ کمرے میں ایک خوبصورت پوشاک بکھری پڑی تھی۔ اور شہزادی آئینے کے مقابل ایک کرسی پر جلوہ افروز تھی۔ اس وقت وہ اپنا نفیس ترین لباس پہنے ہوئے تھی۔

میں نے آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میں اس کے پاس پہنچا۔ لیکن اس نے میرے خیر مقدم کے لئے ایک لفظ بھی منہ سے نہ کہا۔ نہ اس کے جسم کو کوئی حرکت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی ہے۔ میں اس کے منہ کے سامنے اپنا ہاتھ لے گیا۔ سانس کی آمد و رفت کا کوئی پتہ نہ چلتا تھا۔ اس کا دل بالکل ساکت ہو چکا تھا۔ آہ شہزادی کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اس کے پاس ہی شکستہ الفاظ میں لکھا ہوا ایک خط پڑا تھا۔

"میری پیاری شہزادی! مجھے سخت افسوس ہے کہ میں تمہارا آخری دن مقررہ وقت پر واپس نہ دے سکا۔ کسی عورت نے میری حیرت انگیز کہانی پر اعتبار کر کے مجھے اپنی عمر کا کوئی قلیل ترین حصہ بھی بطور قرض دینا گوارا نہ کیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میری بیٹی کی زندگی خطرے میں ہے۔ میں تمہاری درخواست پوری کرنے کی سعی

الامکان کوشش کروں گا۔ اور تمہیں اپنی کامیابی یا ناکامی کی اطلاع بھی فوراً کردوں گا۔ ——————

میں آخری وقت تک تمہاری خوشنودی کا طلب گار رہوں گا —— "

تمہارا احسان مند

شاعرِ رومان راجہ مہدی علیخاں صاحب کے نادر زمانہ شاہکار

دنیا کی رنگین مزاج عورتیں | یہ کتاب دنیا کی مشہور و معروف شہزادیوں اور ملکاؤں کے عشقیہ داستانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپکو معلوم ہوگا کہ عورت خواہ ملکہ ہی کیوں نہ ہو محبت سے مجبور ہو کر ایک حبشی کے قدموں پر بھی سر رکھ دیتی ہے۔ کتاب کی نثر پر نظم ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ قیمت کتاب مجلد عہ/

ستارۂ صبح | دنیا کے ہر ملک کے بہترین افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ منتخب کر کے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے اس کا ایک ایک افسانہ آپکو عشق و محبت کی مہکتی ہوئی وادیوں کی سیر کرائیگا قیمت مجلد عہ/

کملا | بنگالی زبان کے مشہور ناول "بار رواری" کا اردو ترجمہ ہے۔ اور بنگال کے بارہ مشہور مصنفوں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ ناول اردو ادب میں اپنی طرز کا نرالا اور پہلا شاہکار ہے۔ ایک مرتبہ اسے شروع کر دیں گے۔ تو ختم کئے بغیر آپ کو چین نہیں آئے گا یہ ایک پاکیزہ محبت کی داستان ہے جس میں آہوں آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا طوفان آپکو عجیب فضا میں لے جائے گا۔ قیمت مجلد کتاب عہ/

شمع حرم | اس کتاب میں حجاب امتیاز علی۔ زینب حمیدہ سلطانہ۔ سیتا چیٹرجی ڈاکٹر رشید جہاں عصمت چغتائی۔ شانتی دیوی۔ مسز اللتی دیوی۔ مسز عبدالقادر جیسی افسانہ نگار خواتین کے افسانے شامل ہیں۔ یہ کتاب دیکھکر آپ کو معلوم ہوگا کہ عورت مصور، مو قلم ہاتھ میں لیتی ہے۔ تو کاغذ پر حقائق زندگی کی ایسی دلکش اور لاجواب تصویر کھینچ دیتی ہے۔ کہ قابل سے قابل مرد مصور بھی حیرت سے اس کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ ان بے بہا گوہروں کو اکٹھا کرنے کا سہرا بھی راجہ مہدی علی خاں صاحب کے سر ہے۔ عہ/

ملنے کا پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

نرائن دت سہگل پبلشر نے امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام پنڈت دھرم چند بھارگو بی۔ اے پرنٹر کے چھپوا کر لوہاری گیٹ لاہور سے شائع کیا:۔